جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

تمدن

ماشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا مخزن

یڈیٹر ۔ شیخ محمد اکرام ۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول (۴) قسم دوم (۲) — تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا — قیمت فی پرچہ ۱۰؍

کتبہ احقر ابو ظفر حامد مرزا دہلوی

تمدّن

یہ **ہمارے** صفحہ کا باتصویر رسالہ ہر انگریزی مہینہ کی آخیر تاریخوں میں اُن منتخب اہل قلم حضرات کے مضامین سے مزین ہو کر شائع ہوتا ہے جو اسوقت ملک و قوم کے واسطے مایۂ ناز ہیں

تمدّن کے مقاصد میں زبان اُردو کی خدمت کے علاوہ سب سے بڑا مقصد حقوق نسواں کی آواز مردوں کے کان تک پہنچانا ہے۔

تمدّن ایک نہایت آزاد پرچہ ہے جسمیں کوئی مضمون بشرطیکہ وہ تعصب اور پالٹکس سے علیحدہ ہو اسوجہ سے ہرگز رد نہیں ہو سکتا کہ **تمدن** اس سے متفق الرائے نہیں ہے۔

تمدّن میں نثر و نظم کے صرف وہ مضامین درج ہوں گے جو خواتین کے مطالعہ سے گذر سکیں ÷

تمدّن دو قسم کے کاغذ پر اوّل و دویم باتصویر شائع ہوگا **قیمت** قسم اوّل (عہ سالانہ) قسم دوئم (عہ) نمونہ کا پرچہ (۱۰/ عہ)

دلی شکریہ کے مستحق ہیں حضرات ذیل جنھوں نے تمدن کی اشاعت میں حصہ لیا:۔

مولوی ابو النعیم سید تصدیق احمد صاحب۔ شاہ گنج۔ مولوی نور احمد صاحب شاہ گنج۔ مولوی لطیف الدین صاحب بمبئی۔ مولوی محمد اسد مرزا دہلوی۔ شاہ گنج۔ مولوی سید ابو العاص صاحب بانکی پور۔ مولوی جواد علی خانصاحب عالی دکن۔ مولوی ابو حامد سیّد محمد مہدوی صاحب دکن۔ منشی لیاقت علی صاحب کمالپور۔ منشی سید محمد حامد حسین صاحب مظفر نگر۔ منشی مختار احمد صاحب مظفر نگر۔ سید شوکت صاحب دہلوی۔ نواب نظیری بیگم صاحب کلکتہ۔ منشی محمد حسین خانصاحب متر انوالی۔



دربار اکبر ثانی

تمدّن
دہلی

تمدّن اسلام

نمبر (۳)

مُغل اون خوش نصیب قوموں مین جنھیں افعال شنیعہ اور خفیف الحرکتی میں صدیاں گذریں تہیں۔ مگر زمانہ نے اون کا راز طشت از بام نہیں کیا۔ ایک مغلوں کی قوم بھی ہے۔ جو سائبیریا کے جنوبی میدانوں میں اپنی وحشیانہ کارگذاریوں کا جال پھیلائے خونخوار اور لاگو درندوں کی طرح بے حساب انسانی زندگیوں کا خون کر رہے تہے۔ اور ہر ایک بدنامی یا دار و گیر سے بری الذمہ تھے۔ کیونکہ اُن کے افعال سے نہ کوئی شخص بجز اُن بیگناہ مقتولوں کے واقف تھا جو کبھی کبھار اُن بیہڑ راستوں سے ہو گذرتے تہے جہاں اُن کا عمل و دخل تھا۔ اور نہ وہاں کوئی زبردست قوت اُن پر حاوی تہی جو اُن کے کرتوتوں کی انہیں سزا دیتی۔

غرضکہ نہایت اطمینان اور زمانہ کی آنکھوں سے بالکل اوٹ ہو کر وہ اپنے رنگ میں

اپنی زندگی کو نہایت خوشگوار طریقوں سے بسر کر رہے تھے کہ اونکی آنکھوں نے ایک عجیب و دلکش نظارہ کا مشاہدہ کیا جس کے مشاہدہ میں انہوں نے اپنی طرز زندگی سے زیادہ مسرت بخش خوشی کا احساس کیا۔

یہ نظارہ مسلمانوں کے فتح و اقبال کا تھا جو جزیرہ عرب سے داب کشورکشائی کے ساتھ نکلے تھے اور جو سرزمین ترکستان میں اپنی فاتحانہ عظمت کا نشان گاڑ چکے تھے +

چونکہ مسلمانوں کو ہر کمال اور ہر وصف میں اونہوں نے یکتا ئے روزگار پایا۔ اس لیے مسلمانوں کی ہر ادا اُن کے دل میں گھر کرتی اور اونکی نگاہوں میں چبھتی جاتی تھی کتب اور فنون میں اون کا انہماک۔ ذوق کمال اون کی جفاکشی۔ اون کا اقبال اون کی دولت۔ جاہ و مکنت۔ اثر اور طاقت اور باہمی الفت و محبت۔ غرضکہ اُن کی ہر ہر بات میں متجسس نظروں نے شان دلکشی پائی جس کی اون کے ستم پیشہ دل و دماغ پر قبضہ و فتح حاصل ہوتی جاتی تھی۔ جسکا اثر یہ ہوا۔ کہ اُنہوں نے مسلمانوں کی ادائیں سیکھیں۔ اون کے نقش قدم پر چلے اور بالآخر اس تقلید اور تتبع کا پھل اونہیں یہ ملا کہ اُن مغلوں کی جو ایک گمنام اور بادیہ نشین قوم تھی دنیا میں سلطنت قایم ہوئی۔ جس کے بعد کئی صدیوں تک اون کا دور حکومت رہا۔ اور جس کے زیر سایہ اکثر زبردست اور عظیم الشان سلطنتیں مثل اقطائی۔ طلوئی۔ جوجی۔ چغتائی۔ قتیں۔ اس کے علاوہ زنگار سائبیریا۔ اور ترکستان میں متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بھی اونکی قایم ہوئیں +

جب فتح و اقبال کا سہرہ زمانہ نے اُن کے سر باندھا۔ تو اونکو یہ بھی

حوصلہ دیا کہ جن اقالیم پر اہل عرب سکہ زن ہیں وہاں مغلوں کا سکہ رواں ہو۔ چنانچہ یاوری اقبال سے اونہوں نے یہ ارادہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس منصوبہ کو یوں پورا کر دکھایا کہ نسل تاتار کے مشہور و معروف سردار چنگیز خاں کے سرگروہی میں مسلمانوں پر فوجکشی کی جس سے سلطنت اسلام کا ایک حصہ ان کے قبضہ میں آگیا۔

اسلام کی اوس خصوصیت نے جسکا منشا یہ ہے کہ جو قومیں علم و تہذیب کے اثر سے ہمیشہ بے بہرہ رہیں۔ اسلام نے جلتے ہی اون کے تمام حالات میں انقلاب برپا کر دکھایا۔ یہاں بھی جلوہ افگن ہوئی۔ جسوقت تک مغل اسلام نہ لائے تھے تہذیب و روشنی کا چلن انہیں نہ تھا لیکن جب وہ اسلام کے بابرکت حلقہ میں آنے لگے۔ تو تہذیب اور علم کی روشنی وہی اون میں آنے لگی جو اسلام کا خاصہ ہے۔

اس روشنی کے زمانہ میں بڑے بڑے علما، حکما، مدبر، پالیٹیشن انمیں پیدا ہوئے شاندار مساجد۔ مدارس۔ اجرام فلکی کا راز بتانے والی رصدگاہیں۔ انہوں نے بنوائیں۔ شہر بسائے جنمیں فلک نما قصور۔ باغ بہشت کے نمونے پر طیار کرائے۔ اور جملہ سامان ترقی مہیا کیئے۔

غرضکہ اعلیٰ تمدّن کے زمانہ میں جو جو ترقیاں ملک میں ہوتی ہیں اون سے انکا عہد آراستہ و پیراستہ ہوا۔ جس کی یاد دلانے کے لیئے گلزار تاریخ کے سجے سجائے تختہ ہائے گل موجود ہیں۔ اور سیر کے لیے محض مطالعہ کی عینک درکار ہے۔

بربری | شمالی افریقہ کے بادیہ نشین یا بدو۔ جو بربر کہلاتے ہیں جبتک اسلام نہیں لائے تھے وحشی پرست وحشی۔ اور اہل بادیہ تھے انسانی

گردوں کے میل ملاپ اور آباد مقامات سے دور دور بھاگتے تھے۔ اہل یونان و روما کو ان کی سفاکی اور بے دردی کی بدولت بڑے بڑے مصائب اور نقصانات برداشت کرنے پڑے مگر اون کا انسداد امکان سے باہر ہی رہا۔

عربوں سے بھی اُن کی فتوحات کے زمانہ میں اون کی جسارت جانبازی نے یہ تسلیم کرا لیا تھا۔ کہ ان کا زیر کرنا کوئی منہ کا نوالا نہیں۔ اور پھر عرب ہی ایسے تھے۔ جنھوں نے اُن کی مشکیں باندہ کر اُن کی رگیں ڈھیلی کیں۔ لیکن جب وہ اسلام لائے۔ تو اون کی وہ قوتیں جو امن عامہ میں خلل انداز اور فسادات کی جڑ تھیں جن سے زیان مال کا خطرہ تو ایک طرف خود انسانی زندگی معرض خطر میں تھی۔ انہیں فسادات کی روک تھام میں صرف ہوئیں۔ قبل از اسلام اگر ان کی جلادت سے بیگناہوں کا قتل ہوتا تھا۔ اور اُن کا مال غارت، تو بعد اسلام لانے کے امن کے پھیلانے اور ان مظالم کے فرو کرنے کا کام انہیں سے لیا گیا۔ پہلے اُن کی وہ قوتیں جو رہزنی اور قطاع الطریقی کے رکیک افعال میں صرف ہوتی تھیں وہ بعد اسلام لانے کے شرعی اور سیاسی جنگوں میں صرف ہونے لگیں جن کے حاکم و آمر عقل و عدالت تھی۔

چنانچہ یوں تمام فتوحات اور خصوصاً مغربی بلاد و امصار کی فتح و تسخیر میں انکی شرکت ایک زبردست کمان کے ہم پلہ رہی +

دول فاطمیہ مر در ینہ اور ادریسیہ کی بقا اور استقلال کو اُن کی قوتوں نے بہت کچھ اہمیت دی تھی۔ مرابطین اور موحدین وغیرہ حکومتوں کے بانی بھی یہی ہیں +

طارق ابن زیاد انہیں کی شجاعت و اصالت پر بھروسہ کرتا ہوا فتح

اندلس کو روانہ ہو فنون سپہگری کے سوا تمدّن اور شائستگی کے مدارج میں بھی اِس قوم نے درجہ حاصل کیا ہے۔

قوم زنگی

گو آج زمانہ کی رفتار ایسے انکشافات کی اٹھکیلیوں سے بھری ہے جس نے اُن مسائل کی پردہ دری اور تکذیب میں جو سلف سے بطور مسلّمات چلے آتے تھے۔ کوئی دقیقہ اوٹھا نہیں رکھا۔ مگر یہ مسئلہ جس طرح سلف کے مسلّمات سے تھا۔ ویسا ہی آج بھی قابلِ تسلیم ہے کہ قوم زنگی دنیا کی تمام قوموں میں مدارج انسانیت کے لحاظ سے پست، اور اخلاقی اعتبار سے بدترین نسل آدم ہے باوجود نفوسِ انسانی میں اُن کا شمار ہونے کے بھیڑ اور بکری کی طرح اُنکی خرید و فروخت کی گئی۔ مگر وہ اپنی فطری اور جبلی ذلت کی وجہ سے ہمیشہ قانع اور راضی برضا ثابت ہوئے اور ان کی اِس فطرت پر زمانہ کی ترقی کا کوئی رنگ نہ آیا نہ گیا +

اس قوم کا اصلی مولد و مسکن تو شمال افریقہ ہے مگر افریقہ کے شرقی اور غربی مقامات میں بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب عساکر عرب ربع مسکون کو کھنگال رہے تھے تو کسی ریلے میں اِن کے چند قبائل ان مقامات سے وسط افریقہ اور سواحل کی طرف جا پڑے۔ جو بعد کو مثل شمالی افریقہ کے ان کا مولد و مسکن بن گئے۔

اِن قبائل کے جلاوطن اور حملہ آور عربوں سے اُن کا تصادم اُن کی اخلاقی اور عملی نشو و نما کے لیے ایک خوش آیند فال تھی۔ کیونکہ عربوں کے دیکھا دیکھی اپنے طرزِ عمل کی درستی کا انہیں احساس ہوا جس کا اثر اون کی درستی اخلاق پر بھی پڑا پھر رفتہ رفتہ اونمیں اسکا ایسا چسکا پڑا کہ کسب فضائل کرکے وہ دوسرے متمدّن قوموں کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ وہ عربوں کے اثر سے اسلام لائے۔ اِس کے

بعد اُنھوں نے عرب مجاہدین کے قوت بازو بنکر خلفار اور سلاطین کے اشاروں پر زبردست لڑائیوں میں اکثر جوہر شجاعت دکھائے انمیں ایسے بھی مرد آدمی ہوئے کہ مرحلہ دیانت و وفاداری میں ان کے غیر معمولی تدین اور غیر عادی پائے ثبات سے متاثر ہو کر بعض خلفا نے انہیں اپنی خانگی زندگیوں کا شریک بنایا۔ اُنھوں نے بسا اوقات دربار خلافت میں اپنا یہ اعتبار بھی پیدا کر دکھایا ہے کہ حل و عقد سلطنت اور عزل و نصب اون کے اقتداری آمد ہو گئے۔

بہ ایسے اولوالعزم اور عالی خیال بھی ہوئے کہ اکثر اون کے سر میں یہہ سودا بھی سمایا کہ وہ حاکم علے الاطلاق بنکر رہیں چنانچہ دوسری مہذب قوموں کی طرح اونھوں نے بھی برابر کی سلطنتوں سے مقابلہ اور اپنے کو بادشاہ منوانے کے لیے آراستہ لشکر و باقاعدہ فوجیں طیار کیں۔ اور مدتوں مصروف پیکار رہے سلطنت عباسیہ کو سالہائے سال تک ان کے ان جوشیلے ارادوں کی وجہ سے چین لینا نہیں نصیب ہوا ان کی کوئی بڑی سلطنت تو قایم نہیں ہوئی لیکن متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتیں وسط اور غربی افریقہ میں قایم ہوتی رہیں۔

دماغی صلاحیت کے لحاظ سے اونمیں دقیقہ رس اور نازک دماغ مدبرین سیاست اور عدالت بھی ہوئے جن کے نام دنیا میں شہرت نصیب ہی ہیں۔

کافور الاخشیدی ان میں ایک نامور شخص ہو گذرا ہے جس کے متعلق حکومت مصر تھی اس صلاحیت اور ترقی نے اونہیں امور معاملہ سے فنون لطیفہ کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ اکثر داد شعر دینے والے نازک خیال شعرا بھی اس طبقہ سے نکلے جنھوں نے اپنے قصیدہ خوانیوں سے صلہ و انعام

[illegible]

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

(۱)

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی
کیوں ترا راہگذر یاد آیا۔
مگر جب یاد آ ہی گیا، تو چل، اے دل چل۔ لیکن دھیرے دھیرے چل رے دوانے، دھیرے دھیرے چل

ایسی بیتابی کی کیا ضرورت ہے، مانا کہ تجھے اسیر کرنے کے لیئے احباب، اعزا، فرائض و علائق سب جال پھیلائے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں پہونچنے کے لیئے ایک جست کی ضرورت ہے۔ مگر مجھے بھی تو ساتھ لیچلنا ہے

وطن سے یہ دوسری مرتبہ ہے کہ میں باہر جاتا ہوں؟ اور دونوں مرتبہ میرے ساتھ "ظلم" کیا گیا۔ میں انس محبت کے برتاؤ کو ظلم ہی سے تعبیر کرتا ہوں۔ جانے والے کے دل کو الفت اور مہماں نوازی سے لبھالینا، اسپر ظلم کرنا ہے کیونکہ وہ اپنے ملک سے باہر جاکر اسے یاد کر کر کے تڑپتا ہے۔ بمبئی میں، اپنے کلاس فیلو "ڈاکٹر" سید محمد (جن کی بے ریا، پر صداقت مہماں نوازی کے عوض میں میں صرف "تھینک یو، ڈاکٹر" کہہ سکتا ہوں) اور مس ہیکل اخلاق و تواضع ہز ہائی نس نواب جنجرہ جو تواضع زگردن فراداں نگوست کی زندہ تصویر ہے، اور مس عطیہ فیضی اور ان کے

خاندان کے التفات و توجہات کے چھاپے دل پر لیے ہوئے جہاز پر سوار ہوا۔ یہ چھاپے اب تک ویسے ہی گہرے ہیں اور رہیں گے۔
جہاز نے لنگر اٹھایا، اور میں گھنٹوں تک یہ شعر پڑھتا رہا؎

پھرو ہیں لے چلا مجھے دیکھو　　دل خانہ خراب کی باتیں

بلاد عثمانی کی طرف یہ میرا دوسرا سفر ہے۔

کوئی صاحب، ان اوراق میں مصر اور استنبول کے متعلق "معاشرتی، ادبی، سیاسی و تمیدانم چہ وچہ حالات" کے جویا نہوں۔ نہ میں وہ غائر نظر رکھتا ہوں کہ ان حالات کی تدقیق کرسکوں، نہ نفوذ رکھتا ہوں نہ علم رکھتا ہوں۔ ان حالات کے لیے لائق اور قابل حضرات کے سفرنامے ملاحظہ ہوں۔ اُن سے آپکو بالتفصیل معلوم ہوگا کہ دخترینہ ہمالوں موزہ خانہ ہمالوں میں کیا کیا چیزیں رکھی ہیں، اور کس ترتیب سے رکھی ہیں۔ مکاتب عالیہ، درشدیہ، واعدادیہ کی تعداد کیا ہے۔
ان اوراق میں اک وارفتۂ محبت کے ہزیانات ہیں اور میں تو صرف یہ کہتا ہوں:-

جو آج جائزہ لیتا ہے جاں نثاروں کا
لبیک! لبیک!! لبیک!!!
ہمارا نام بھی لیکر پکار ہم بھی ہیں۔
لبیک! لبیک!! لبیک!!!

سمندر پرلطف تھا۔ یہ لوسٹتے وقت کا ذکر نہیں ہے۔ اور جہاز کی سوسائٹی بھی پرلطف، راستے میں صرف عدن کو، (جہاں باوجود میرے پاس ووٹ دینے

اور قوی عینک ہونے کے ، مجھے "باغ" نظر نہیں آیا) دور ہی سے سلام کرتے ہوئے دسواں دن تھا کہ "ہم ارض فراعنہ" کے سامنے پہونچے یہاں پہلی چیز جس نے ہماری نظر اپنی طرف کھینچی وہ اُس شخص کا بت تھا جس نے گو دعوی خدائی نہیں کیا، لیکن نیچر کے کاموں میں عظیم الشان تبدیلی کردی دو بر اعظم جدا کر دیئے دو سمندر ملا دیئے ۔ موسیو لیسپ! یہ کامران تو زندہ جیتے سیز نکل سکے۔ اپنا آسمان کے تلے نام کر گیا ۔ جو سے شیر لاینکا کام عشق کے لیے اب بھی باقی ہے ہمارا جہاز دن بھر، نہر سوئز میں چلا کیا ۔ نہر سوئز کے کنارے پر بہت دور تک ریلوے لائن اس قدر قریب ہے کہ جہاز سے دکھائی دیتی ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا، مجھے اسلامی ملک میں ریل! دیکھنے کا شوق اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ میں کئی گھنٹے متواتر جہاز کے ڈیک پر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کوئی ٹرین گذرے ۔ یہ اژدر آہنین ، جسنے دنیا میں ایسے ایسے تغیرات پیدا کر دیئے ہیں، اسلامی ملک میں کس شکل اور کس وضعیت کا ہوگا ۔ اور اک دفعہ اُسے اپنی دہماکے کی چال سے، اس زمین پر چلتے ہوے تو دیکھ لوں ۔ میں نے ساڑھے تین برس بغداد میں گذارے مگر وہاں بغداد ریلوے کی گونج تھی، خود ریلوے ابھی نہ پہونچی تھی ۔ سو یہ حسرت مصر میں جاکر نکلی ۔ مگر اتفاق دیکھئے میں جتنی دیر تک ڈیک پر بیٹھا رہا ٹرین نہ گذرنی تھی نہ گذری ۔ جوں ہی میں ڈیک سے اتر کے اندر گیا لوگوں نے کہا کہ ٹرین گذر گئی ۔ پھر دوسری مرتبہ ڈیک پر جاکر بیٹھا، کھانیکا وقت بھی گذر گیا لیکن ٹرین ندارد جب بھوک نے بہت ستایا، میں کچھ کھانے کے لیے نیچے اترا، اور جھٹ ٹرین صاحب گھڑ گھڑاتی ہوئی گذر گئیں ۔ ایک صاحب، جن سے میں نے اپنے فراق کا حال بیان کردیا تھا، مسکراتے

ہوئے آئے اور یہ خبر سنا کے اور مجھے جلا کے چلے گئے - آخر میں پھر تیسری دفعہ ڈیک پر جا کر بیٹھا - اس مرتبہ اس محبوبہ مطلوبہ نے اپنا جمال دلفزا مجھے دکھایا - اک ترکی ٹوپی ٹرین کو سیے جا رہی تھی - ٹرین چھوٹی پٹڑی کی ٹرین تھی ، اور وہی ہندوستان میں - جزئی اختلاف نظر انداز کر کے میری دیکھی بھالی ٹرینوں سے ملتی ہوئی - مگر میری کیسی حسرت پوری ہوئی!

نہر سوئز کے دونوں کنارے ، (اور وہ ایک دوسرے سے بہت دور نہیں) کچھ جاذب نظر نہیں - دونوں طرف میدان ریگ یا تو وہاں ریگ ہیں اور بس - ایک طرف بادیۃ الشام ہے اور ایک طرف ریگستان مصر ریگستان مصر! آپ مصر کی زرخیزی ، شادابی ، اور چپہ چپہ زمین پر زراعت ہونے کے فسانے سنتے ہیں ؛ یہ فسانے صحیح ہیں ۔ مصر نیل کے صدقے میں اِس سرے سے لیکر اوس سرے تک ایک کشت زار ہے لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں ، پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ ہیں اور سر بفلک کشیدہ کھجوروں کے درخت ہیں - مگر یہ آپکو آگے چلکر ملیں گے - مصر میں ریگستان ہی ہے اور یہ مصر کو نظر بد سے بچانے کے لیے ، کاجل کا ٹیکا ہے - اور جیسا کوئی کاجل کا ٹیکا ، کسی پیارے حسین بچے کو نظر بد سے نہیں بچا سکا ، یہ کاجل کا ٹیکا بھی بیکار ہی نکلا -

ہم آدھی رات کو پورٹ سعید پہونچے - پورٹ سعید ، زبردست بندرگاہ ہے بہت سے جہاز ، موٹر کشتیاں ، آجا رہی تھیں اور جہازوں کی سیٹیوں کا تار بندھا ہوا تھا - میں حیران تھا کہ ان نالہائے نیم شبی کے سبب رہائشی پورٹ سعید کیسے سو سکتے ہوں گے - ایک دو گھنٹے بعد ، کنارے سے ملے ہوئے ایک ہوٹل میں سے کیر خرّانٹے لینے نے بتا دیا کہ یوں! - (باقی جب میں جاگوں)

سجاد حیدر (قسطنطنیہ)

محمڈن یونیورسٹی

از مولوی احمد علی صاحب شوق، قدوائی، لکھنوی،

او سوادِ علم، تجھ پر حکمرانی چاہیئے — او حروفِ صفحہ، تم سے نکتہ دانی چاہیئے
او قلم، تو شاخ ہے، تو گل فشانی چاہیئے — او سخن ہے بحر تجھ میں، تو روانی چاہیئے

او صریرِ خامہ، تو مطلب ادا کر، لول کر
کہہ دو اتوں سے، کہ کچھ دیکھیں یہ آنکھیں کھول کر

جہل کے بڑھنے سے عزت قوم کی کتنی گھٹی، — جتنی یہ آگے بڑھی تھی، اتنی ہی پیچھے ہٹی
لٹ گئی یہ، دولت اسکی جاکے غیروں میں بٹی — مثل بالوں کے پریشاں ہو گئی، ایسی کٹی

قوم میں، اب تو، فقیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
زر کہاں، کف میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

جہل سے رستا ترقی کا نظر آتا نہیں — رات اندھیری ہو، تو کوئی شے نظر آتی نہیں
چھپ رہی دولت، ہمیں اب شکل دکھلاتی نہیں — ہم سے شرماتی ہے وہ، غیروں سے شرماتی نہیں

ہم سے کیا مطلب، اگر دنیا میں دھن برسا کرے
ہم رہیں مفلس، ہماری آرزو ترسا کرے

عید کا دن، اور بلا نازل ہمارے گھر پہ ہے — عیش کیا آئے، کہ بیٹر مفلسی کا در پہ ہے
زر نہیں، او منحصر بچوں کی زینت زر پہ ہے — پاؤں میں ان کے نہ جوتا ہے، نہ ٹوپی سر پہ ہے

عیش و غم کے واسطے، سامان اب تو ایک ہے
عید گاہ اور کربلا کی شان، اب تو ایک ہے

ضعف دیکھو ان یتیموں کا کہ چل سکتے نہیں — خشک پیڑ ان کو سمجھ لو، پھول پھل سکتے نہیں

لیں سنبھالا موت کا، یوں تو سنبھل سکتے نہیں　　جان نکلے، حوصلے لیکن نکل سکتے نہیں

ان کے مورث، بن کے جاہل، علم سے بےحس رہے
ان کو ترکے میں ملا افلاس، یہ مفلس رہے

کیا پڑھیں یہ، کیا لکھیں، پامالِ درد ہیں　　ان کے جسموں میں نہیں خوں، ان کے چہرے زرد ہیں
ان کے نالے گرم ہیں اور ان کی آہیں سرد ہیں　　ان کے اعضا خاک ہیں اور ان کی جانیں گرد ہیں

غم میں دل ہے، دل میں غم ہے، کیا کریں ناچار ہیں
سر میں درد، اور درد میں سر، روتے ہیں بیمار ہیں

اک اِدھر سے آئی، طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا[1] کی صدا　　آ رہی ہے اس گھڑی، اُتر[2] کی جانب سے ہوا
ہو نہ ہو، ہے یہ علیگڈھ کا پیامِ جانفزا　　ہو نہ ہو آیا ہے یونیورسٹی کے قصر کا

ایک ہی آواز ایسی، مچ گئی کالج میں دھوم
[3]ہَنَا رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّتَعْلِيْمُ الْعُلُوْمِ

اب تو کالج بول اُٹھا، میرا مقدر دیکھنا　　آج جو دیکھا ہے، کل اور اس سے بڑھ کر دیکھنا
وہ کھڑا ہے اوج، وہ اقبال در پر دیکھنا　　چترِ گردوں پھر رہا ہے میرے سر پر دیکھنا

نام اچھالوں قوم کا، بچوں کی شان اوج سے
فتح کر دوں میں قلم و علم کی اس فوج سے

باغ سید کا جب خطۂ اخلاق پر　　سایۂ علم اس نے ڈالا، پھیل کر آفاق پر
جبری مذہب وہ ہی قائم قدرتِ خلاق پر　　ثبت ہے "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ"[4] اس کے سب اوراق پر

اس کے پودے، قوم کے بچے ہیں، پھل لائیں گے یہ
آج پھولے ہیں، ثمر شاخوں میں، کل لائیں گے یہ

یاس کو زک دے کے، امیدِ ترقی ور رہی　　ہو یہ کالج علم و دولت کا خزانہ، تو سہی
بلکہ آغا خان کا رخ، یہ بات کالج نے کہی　　شارحِ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ہیں یہی

[1] خوش ہو کے ساتھ اس [illegible] [2] [illegible] اتر کی جانب [illegible] [3] [illegible] اور [illegible]

قوم کے ہونٹوں پہ، اُن کی گفتگو کا شور ہے
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا[۱]، کا شور ہے

بے ادب بنکر تمھیں، وقفہ کروں کیا تاب ہے — تم ہی آغا خاں ہیں عیسیٰ اپنے ہر انداز سے
قوم مردہ تھی، اسے زندہ کیا اعجاز سے — جان ڈالی قُم بِاِذْنِ اللّٰہ[۲] کی آواز سے

سایۂ رحمت ہے، سایہ ان کا سارے ہی قوم پر
آیۂ[۳] رحمت، ہوا نازل، ہماری قوم پر

فخر اِس کالج کو ہے، دنیا میں جس[۴] کے نام سے — سو رہا ہے، گوشۂ مسجد میں، وہ آرام سے
جاگ جاگ او سونے والے، خوش ہوا تیرے کام سے — علم کا اثر ہے جاری، تیرے فیضِ عام سے

یہ ترے مشتاق[۵] ہیں، دیکھ ان کو آنکھیں کھول کر
شہ انہیں نے دی تھی، کالج کی، تجھے ہاں، بول کر

کیا ہمیں بھولا ہے سید، یہ نہیں ممکن نہیں — قوم ہی میں ہے لگا دل گو خود وہ ہے جنت نشین
یوں کہیگا، کرکے سجدہ، جانب عرشِ بریں — شکر تیرا یا الٰہی، تو ہے رب العالمیں

کالج اب دنیا میں جنت کا نمونا ہوگیا
جنتیں[۶] دو، میں نے پائیں، لطف دونا ہوگیا

اسکو کالج سے بہت اُلفت تھی تو یہ قیاس — روح اس کی پھر رہی ہوگی اسی کے آس پاس
قوم سب مل کر کرے اللہ سے یہ التماس — کردے سر سید کو زندہ، دے کے پھر جسم و حواس

التماسِ طولِ عمر، اس کے لیے کرلے گی قوم
اپنی اپنی عمر کا، ایک ایک حصہ دے گی قوم

---

۱ ہرگز نہ پہونچوگے بھلائی کو اگر تم خرچ نہ کروگے۔ ۲ اٹھ کھڑے ہوئے ہو ساتھ حکم خدا کے ۳ لفظ آیۃ مذکر ہے ۱۲ ۴ سر سید احمد خاں مرحوم۔ ۵ نواب مولوی محمد مشتاق حسین خاں بہادر جو آج کل علیگڈھ محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری ہیں سب سے پہلے اس کالج کے قایم کرنے کے لیے سر سید کے ارادے کو انہیں نے قوت دی تھی ۶ یعنی ایک جنت اعتقادی جسے اصلی کہنا چاہیئے اور دوسری جنت کالج کی جہاں سید کی تربت

شرط یہ ہے، پھر نہ سرسیّد کو مرنے دیں گے ہم — پھر نہ اُنکی عمر کو، ہرگز، گذرنے دیں گے ہم
پھر نہ آنکھیں پھیرنے، اور بند کرنے دیں گے ہم — پھر نہ اِس کالج کے زینوں سے اُترنے دیں گے ہم

وہ ہمارا خضر ہے، ہستی کے عالم میں رہے
وہ ہمیں رستا بتانے کے لیے ہم میں رہے

مٹ نہیں سکتی فنا کے بعد فطرت پھر حیات — توبہ! کیا میں کہہ گیا، فانی نہیں سیّد کی ذات
وہ ہے زندہ خلق میں، جب تک ہے باقی کائنات — وہ ہے زندہ قوم میں، جب تک ہے کالج کو ثبات

کالج اُس کا جسم ہے، تعلیم اُس کی جان ہے
قوم کے بچوں میں اعضائے بدن کی شان ہے

کس محبت سے مسلماں کر رہے ہیں یاد اسے — دے رہے ہیں سب دُعائے مغفرت سے داد اسے
بن کے یونیورسٹی، کالج کرے اب شاد اُسے — دے مسرت سے اُسی کا دل، مبارکباد اُسے

تب تو سوچیگا کہ رضواں سے یہ کہنا چاہیئے
اپنی جنت لے، مجھے، کالج میں رہنا چاہیئے

تربتِ سیّد کو، قدرت نے دیا، کتنا وقار — صاف کرتی ہے ہوا، جاروب کش بنکر غبار
شب کو شبنم، پانی موتی، اُس پہ کرتی ہے نثار — صبح کو کرنیں چڑھایا کرتی ہیں سونے کے ہار

کیا کشش ہے، آتی ہے، کیا بوئے اُلفت خاک سے
دل مسلمانوں کے لپٹے ہیں، مزارِ پاک سے

یاد ہے، کالج سے مسٹر بک[1] کی اُلفت یاد ہے — اُن کی تقریر، اُن کی تحریر، اُن کی محنت یاد ہے
قوم کے محسن[2]، ہیں یاد، اور اُنکی ہمت یاد ہے — وہ شگفتہ اُن کی پیشانی، وہ صورت یاد ہے

---

[1] مسٹر تھیوڈر بک متوفی جو علی گڑھ محمڈن کالج کے پرنسپل تھے وہ مسلمانوں کے بڑے ہمدرد تھے اور یونیورسٹی کے لیے انہوں نے بے حد کوششیں کی تھیں [2] نواب محسن الملک مہدی علیخاں مرحوم جو سرسید کے بعد کالج کے آنریری سکرٹری ہوئے تھے اُن کے عہد میں کالج اور اسکے سرمایہ نے بہت ترقی کی، ۱۲

پھر رہے ہونگے وہ، جنت میں لبِ خنداں کے ساتھ

آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں کے ساتھ

گو ہے کالج، معدنِ اب بھی بے بہا ساماں کے   لوگ، علموں کے جواہر چنتے ہیں اس کان سے
قوم لیکن کہہ رہی ہے، جوش سے، ارماں سے   اور اسے چمکاؤ، یونیورسٹی کی شان سے

ہو بنا مستحکم ایسی، جو سمک[1] سے جا ملے
اس قدر چھت کو اچھالو، جو فلک سے جا ملے

چار جانب خوب آغا خاں نے پھیلائی صدا   پہلے چوپائی ہوا تھی اب ہے چوپائی صدا
وہ، اودھ، بنگال اور پنجاب سے، آئی صدا   وہ ہوا، بمبئی سے اور مدراس سے لائی صدا

دی صدا، ہز ہائینس نے، اٹھ کے اس انداز سے
ہند گونجا، اَسْرِفُوْا[2] لِلْقَوْمِ کی آواز سے

مانگتی پھرتی ہے چندے کے لیے، قوم امیں   رحم کر ہم پر خدایا، أَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْن
بعض زر کے جمع ہونے کا نہیں کرتے یقیں   کہہ انہیں شاید، کہ فَأْتُوْنَا[3] بِسُلْطَانٍ مُّبِيْن

سوچ تھا، ہم دینگے، سلطانِ مبین کا کیا جواب
لفظ "سلطان" سے، مگر خود ہی ہوا پیدا جواب

بول اٹھیں، ہز ہائینس نواب سلطان[4] جہاں   مجھ سے ہمت لے، قدم آگے بڑھا، اے قوم ہاں
در خزانے کا کھلا، جس دم کھلا قفل دہاں   مثل سورج کے ہوئیں دستِ کرم سے زرفشاں

---

[1] سمک کے معنی مچھلی، شاعرانہ مراد اس مچھلی سے ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ زمین کو اپنے اوپر لیے ہوئے ہے، از سما تا سمک محاورے میں اسی مچھلی سے مطلب ہے [2] فضول خرچی کرو واسطے قوم کے ۱۲ [3] قرآن پاک کا جملہ ہے، یعنی لاؤ دلیل واضح [4] ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ فرمانروائے ملک بھوپال جنہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں ایک لاکھ روپے عطا فرمائے ہیں، اور اس عطیے کے علاوہ فیاضی کی علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے برقی پنکھوں اور برقی روشنی کے کثیر مصارف اپنے ذمے لیے ہیں ۱۲

تو بھی سورج کیوں کہا، کیا خاک دیتا ہے وہ زر
بخش دیتی ہیں یہ زر، اور پھیر لیتا ہے وہ زر[1]

کی عیاں کرنل عبید اللہ[2] خاں نے شانِ فیض
فیض کو جسم، اور اُن کے دل کو کہیے جانِ فیض
بارشِ زر سے نکالا دل نے جب ارمانِ فیض
جوش سے شملے[3] کی کوٹھی پر اُٹھا، طوفانِ فیض

یادِ[4] قرآن نے، فَلَا تَنْهَرْ پہ مائل کر دیا
قوم سائل تھی، تو کاسہ اُس کا زر سے بھر دیا

شہ حمید اللہ[5] خاں کی مل گئی جب فیض کو
جوش میں لانے لگی ہر جنبشِ لب فیض کو
جانبِ تعلیم، مائل دیکھ کر اب فیض کو
ولولے سمجھاتے ہیں بڑھ کر یہ مطلب فیض کو

رعد جیسے اس قدر ہو، بول بالا قوم کا
آبِ زر چھینٹے، بھرے ایسا پیالا قوم کا

قوم کا جب مرشد ہوا، چندے کی دولت بڑھ گئی
عورتوں[6] کی بالیوں سے زر کی زینت بڑھ گئی
اتحادِ قوم سے ملت کی شوکت بڑھ گئی
حوصلے کا، حوصلہ ہمت کی، ہمت، بڑھ گئی

---

[1] شام کو سورج اپنی روشنی کو اپنے ساتھ سمیٹ لے جاتا ہے ۱۲ [2] جناب کرنل حاجی حافظ محمد عبید اللہ خاں صاحب بہادر، جو ہر ہائنس فرمانروائے بھوپال کے منجھلے صاحبزادے ہیں آج سے چند ہی دنوں پہلے انہوں نے پچاس ہزار روپے علیگڈھ محمڈن کالج کو عطا فرمائے ہیں، اور اب دس ہزار روپے یونیورسٹی فنڈ میں دیے ہیں سنٹرل پراونسز میں اس فنڈ کے متعلق وہ اُس کے پریسیڈنٹ ہیں۔ [3] شملہ بھوپال میں ایک پہاڑ کا قدیم نام ہے جس پر کرنل صاحب بہادر کی کوٹھی ہے وہیں یونیورسٹی فنڈ کے لیے جلسہ ہوا تھا، جس کے پریسیڈنٹ کرنل صاحب بہادر تھے [4] یادِ قرآن سے یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک کا خیال کر کے اور یہ بھی کہ کرنل صاحب بہادر حافظِ قرآن ہیں، فلا تنہر کے معنی ہیں نہ جھڑک

[5] حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، ہر ہائنس فرمانروائے بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے جو یونیورسٹی فنڈ کی تکمیل کے واسطے دلی جوش کے ساتھ توجہ فرما رہے ہیں اور سات ہزار روپے خود اس کے چندہ میں عطا فرما چکے ہیں

[6] شہر بھوپال کی ایک سنگدل بیوی جن کے پاس زر نقد نہ تھا، انہوں نے یونیورسٹی فنڈ میں اپنی سونے کی بالیاں بھیج دیں

رشتۂ الفت سے، سب بھوپال وابستہ ہے آج
قوم، گویا، مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے آج

ہمت اب کہتی ہے، میں بڑھنے کی شیدا ہوں — جوش کہتا ہے کہ بڑھ چل، میں ترے ہمراہ ہوں
بولے آغا خاں، میں خضرِ شاہ راہِ جاہ ہوں — جانتی ہو بھی منزلِ مقصد ہے، خوب آگاہ ہوں

آؤ، لو بخشیں گے سامانِ سفر کنگ[1] امپرر
دیں گے یونیورسٹی کا چارٹر[2] کنگ امپرر

وہ کھڑے ہیں صاحبِ تاج و نگینِ ہند، وہ — وہ ہیں وہ، فرماں روائے سرزمینِ ہند وہ
رہتے ہیں لندن میں لیکن ہیں مکینِ ہند وہ — گھر دلوں میں کرلیا ہے، ہیں دل نشینِ ہند وہ

خوش مسلماں! ایسے شاہنشاہ کے سائے میں ہیں
ان کے سائے میں ہیں، تو اللہ[3] کے سائے میں ہیں

ہر تصور دل کا اب بولا کہ میں امید ہوں — بخت چمکا اور کہا اس نے کہ میں خورشید ہوں
خندہ ہنسکر بول اٹھا، میں عشرتِ جاوید ہوں — کہہ اٹھا دل، اے مسلمانو! میں روزِ عید ہوں

دی صدا کالج نے، مجھکو چارٹر درکار ہے
بندہ پرور! اک نگاہ لطف ادھر درکار ہے

ساتھ لیکر جب لوگوں کو وہ آغا خاں بڑھے — جیسے امیدوں کو لیکر ہمتِ انساں بڑھے
جیسے کرنوں کو لیے خورشید نور افشاں بڑھے — نیکیوں کے ساتھ جیسے قوتِ ایماں بڑھے

لوگ اترلاتے ہوئے، پیرو بنے، یوں، پا کے ساتھ
جیسے لہراتی ہوئی، موجیں چلیں دریا کے ساتھ

---

[1] کنگ کے معنی بادشاہ اور امپرر کے معنی شاہنشاہ، انگریزی میں ان الفاظ کو ملا کے مفہوم یہ رکھا گیا ہے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ۔ [2] چارٹر انگریزی میں اس شاہی سند کو کہتے ہیں جو بادشاہ کے حضور سے عطا ہو ۱۲۔ [3] اس اعتبار سے کہ بادشاہ ظل اللہ ہے ۱۲

وہ کھڑے جا کر کھڑے کنگ امپرر کے سامنے
رخ پہ فرحت، اور رخ آنکی نظر کے سامنے
اب تو عائیں قوم کی، پہنچیں آخر کے سامنے
بخت چمکا جاکے شاہ بحر و بر کے سامنے

سرنوشت قوم کو، ہز ہائینس پڑھنے لگے
آرزوئیں کھل پڑیں، اور حوصلے بڑھنے لگے

ایڈریس سنکر ہوا شکل تمنا کا ظہور
لب ہز آغا خاں کے جنباں، دل میں تمنا، رخ پہ نور
سنتے ہیں کنگ امپرر، اور کرتے ہیں ظاہر سرور
ان کے ہونٹوں کا تبسم، کچھ تو کہتا ہی ضرور

چشم رحمت، لطف کی تصویر دکھلانے لگی
جارٹر کی شکل چتون سے نظر آنے لگی

ہز مجسٹی نے، وہ ہوئے جیب کی ترچھی نظر
جیب میں وہ ہاتھ ڈالا، وہ نکالا جارٹر
بخت کالج بسنے، وہ چمکے حروف آب زر
شوق دیکھو، وہ عطا فرماتے ہیں کنگ امپرر

لے کے، وہ ہز ہائنس[۱] پلٹے خوشی کی چال سے
رخ سے فرحت یوں عیاں ہے جیسے چھوٹ[۲] لال سے

احمد علی، شوق، قدوائی،

---

۱ ہز ہائنس آغا خان ۲ لال عربی میں عین کے ساتھ لعل ہے، اور اردو میں الف کے ساتھ لال بھی صحیح ہے لال کی چھوٹ اس عکس کو کہتے ہیں، جو اس کے رنگ کی تاب سے نکلکر سفید شے پر سرخی کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۱۲-

غزل

صوفی آں سر حقیقت کہ ہویدا میکرد
بحدیثے کہ بما کرد ہم از ما میکرد
پیچ و تابے کہ دل غمزدہ در پنہاں داشت
شکن طرۂ گیسوئے تو پیدا میکرد
دوش از تبسم و ندیدیم کہ طوطی بہ چمن
داستانہا ز لب لعل شکر خا میکرد
فلسفی سر حقیقت نتوانست کشاد
گشت رازے دگر آں راز کہ افشا میکرد
شبلی از قامت زیبائے تو میگردد سخن
یا تو گوئی سخن از عالم بالا میکرد

عورت کی خلقت بھی دلیل واضح ہے وحدانیت خالق کی

عالم کی ہر ایک شے اگر اوسکی حقیقت کو بنظر تعمق دیکھا جائے تو ایک حکیم صانع کا پتہ دے رہی ہے۔ مثلاً ایک بھٹے میں سیکڑوں دانے اور ہر ہر دانہ کے لیے ایک ایک خانہ پھر اُن نازک دانوں کی حفاظت کے لیئے ریشم سے نرم تر ریشے اون پر بچھے ہوئے پھر اون پر کئی غلاف اس ترتیب سے کہ اندر والا غلاف حریر محض سے زیادہ تر نازک اور باہر والا کرباس کے قریب قریب سخت۔ جوہری کی مجال نہیں کہ موتیوں کو بھی اس احتیاط سے رکھ سکے اور ہوا کے سرد و گرم سے اِس طرح بچا سکے یہ حکمت و تدبیر نہ اون دانوں نے خود اپنے لیے کی ہے نہ کاشتکار کی زحمت کو اس میں کچھ دخل ہے نہ ابر و باد کو اس حکمت کے ساتھ کچھ لگاؤ ہے نہ مہر و ماہ کو کچھ تعلق ہے۔ انسان کی عقل ان تمام مصالح و حکم کو سمجھتی ہے اور یہی عقل حجت خدا ہے۔ منکر پر بھی اسنے حجت تمام کر دی ہے۔ مسئلہ ارتقا والے وجود باری کے باب میں خاموش ہیں یہانتک کہ ہکسلی اپنے تئیں متوقفین میں شمار کرتا ہے حیات کے باب میں اپنی تحقیق یہ بیان کرتے ہیں کہ حیوانات میں حیات وہی ہے جو نباتات میں ہے اور نباتات میں ابتدائے حیات یوں ہوتی ہے کہ پہلے ایک تھیلی سی بنتی ہے جس میں جان ہوتی ہے۔ بس یہیں تک علم انسانی کی رسائی

ہوئی ہے لیکن یہ ہنوز سمجھ میں آتا کہ وہ مادہ جو غیر ذی روح تھا کیونکر ذی روح بن جاتا ہے اور غیر مرئی شے کیونکر دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ تیلی جس مادہ سے بنی نہ پہلے وہ مادہ دکھائی دیتا تھا نہ اوس میں جان تھی۔ سہ

نور حیرت ور شب اندیشہ اوصاف تو

بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداختہ

ان حکمائے وقت کا وجود باری میں توقف کرنا اس بنا پر ہے کہ وہ چاہتے ہیں حواس ظاہری سے وجود باری کا پتہ لگالیں اور اون کا یہ کہنا کہ وجود باری ہم پر نہیں ثابت اس کے یہ معنی ہیں کہ حواس ظاہری سے ہم اوس کو نہ پا سکے اور اسباب میں ہم بھی اون کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ حواس ظاہری سے اوس تک رسائی کسی طرح ممکن نہیں فیلسوف ہکسلی جو ان لوگوں میں سربرآوردہ ہے۔ کہتا ہے کہ مادیین کا مذہب یہ ہے کہ مادہ اور قوت کے سوا کوئی اور شے موجود نہیں میں اس مذہب کو غلط سمجھتا ہوں۔ قوت کوئی اور شے نہیں سوا اس کے کہ علتہ حرکتہ اوس سے اولیں۔ میں اس کو نہیں سمجھ سکا۔ ہاں انکشافات علوم طبعیہ سے اتنا ثابت ہوا ہے کہ جسے لوگ مادہ سمجھا کرتے ہیں اوسکا دائرہ وسیع ہوگیا ہے اور جسے محض قدرت الہی کی طرف منسوب کرتے ہیں یا فعل روحانی سمجھتے ہیں اوسکا دخل کم پایا جاتا ہے لیکن اس سے وجود مادہ پر یا مذہب مادیین پر کوئی استدلال نہیں قایم ہوسکتا۔ اور جلد ۹ صفحہ ۱۴۰ میں اوس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی دیوانہ ہی ہوگا جو وجود باری کا انکار کرے انتہی

حکیم برکلی مادیات کے وجود کا منکر ہے اور وہ سچ کہتا ہے کہ مادہ ایک ایک مجہول شے ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں علم مابعد الطبیعتہ سے اوسکو

تعلق ہے اور وجود نفس کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ انتہیٰ۔
راقم حروف کہتا ہے کہ بلاشبہ ہر نفس بخوبی یہ علم رکھتا ہے کہ میں ہوں مگر اس سے بے خبر ہے کہ میں کیا ہوں اور کیونکر ہوں اور کہاں ہوں۔ اسکی توضیح حکیم لوک کے اس مقولہ سے بخوبی ہوتی ہے کہ میں دیکھتا ہوں یا سمجھتا ہوں یا سوچتا ہوں جب کہ خدا کو منظور ہوتا ہے لیکن یہ کیا علاقہ ہے میری سمجھہ میں نہیں آتا انتہی۔ مگر لوک نے مادیات و روحانیات دونوں کے وجود کی تصریح کردی ہے وہ کہتا ہے کہ جس قدر اجسام مادی کا علم ہم کو ہے روحانیات کا علم اوس سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہم کو مادیات کا علم اتنا ہی ہے کہ اوس کے اعراض محسوسہ کا ہم کو حس ہوتا ہے مگر خود وہ شے نامعلوم ہے روحانیات کا علم بھی اسیقدر ہم کو حاصل ہے کہ اوس کے خواص معقولہ کا ہم کو تعقل ہوتا ہے گو خود وہ شے نامعلوم ہے انتہی۔ یہ تینوں شخص اساطین علوم مغاربہ میں سے ہیں ان کے اقوال کے ساتھ حکمۃ مغربیہ کے امام حکیم نیوٹن کی اس تحقیق کو منضم کرکے دیکھنا چاہیئے کہ جس طرح گھنٹی کی صدا یا کسی باجے کے تار کا سُر یا کسی اور چیز کی آواز سوا اس کے کہ ایک حرکۃ ارتعاش ہے۔ اور کچھہ بھی نہیں۔ ہوا میں بھی سوا اسی حرکۃ کے جو کسی چیز میں سے اس میں سرایتہ کرگئی ہے اور کچھہ بھی نہیں۔ اور حاستہ اسی ارتعاش کے حس کو آواز سمجھتا ہے۔ بس یہی حال رنگوں کا ہے کہ اجسام پر جو رنگ ہیں وہ اس کے سوا کچھہ بھی نہیں کہ اون اجسام کی ساخت ایسی ہے کہ فلاں فلاں رنگ کی شعاع کو بہ نسبتہ دوسری شعاعوں کے اچھی طرح منعکس کرتے ہیں۔ شعاعوں میں جو رنگ ہیں وہ بھی اِس کے سوا کچھہ نہیں کہ اون شعاعوں میں یہ خاصہ ہے کہ فلاں یا فلاں قسم کی حرکۃ کو پردۂ چشم میں منتقش کردیں

اور آنکھ اوسی حرکت کے ادراک کو رنگ سمجھتی ہے انتہی۔

نیوٹن کے اِس قول سے جو ثابت و مبرہن ہو چکا ہے ظاہر ہے کہ تمام مبصرات و مسموعات کا وجود ہمارے نفس ہی میں ہے خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھ بھی نہیں ستاروں کا تلالو آفتاب کا لمعان اجسام کا اختلاف الوان بادل کی گرج نغمہ کی شیرینی حروف کے مخارج فقط ہمارے پردہ چشم و پردہ گوش میں یہ سب چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں خارج میں ایک حرکت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بعبارۃ اُخری اِس کا یہ مطلب ہوا کہ عالم میں تاریکی ہے ہم کو روشنی معلوم ہوتی ہے۔ عالم میں خاموشی ہے ہم کو صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے حواس خمسہ کے مدرکات کی۔ انہیں حواس کے ذریعے جو لوگ خدا کو ڈھونڈھتے ہیں وہ تو اوسے کبھی نہیں پا سکتے۔

ہکسلی گو فرقہ لا ادریہ میں سے ہے اور ذات باری اور روح اور مادہ کے ثبوت وجود میں توقف کرتا ہے لیکن اس الزام کو کہ وہ حواس خمسہ پر اپنے مدرکات کو منحصر سمجھتا ہے گوارا نہیں کرتا۔ اوس کا فاضل معاصر فیلسوف للی جب اوس پر معترض ہوا کہ ہکسلی جس چیز کو حواس خمسہ سے محسوس نہ کر سکے اوس کے ثبوت کا منکر ہے تو ہکسلی نے اوس کا جواب یہ دیا مجھے یقین ہے کہ للی کو غلط فہمی ہوئی اور اس غلط فہمی کا احساس حواس خمسہ کے ذریعہ سے نہیں ہوا ہے پھر بھی میں اوس کی غلط فہمی کا منکر نہیں ہوں۔ اور میں للی کی اوس خوش بیانی کا معترف ہوں جس خوبی سے اونہوں نے اعتراض کی تقریر کی ہے لیکن یہ اعتراض بھی حواس خمسہ کے ذریعہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اوس کے استدلال منطقی و سبک عبارۃ کی خوبی میرے ذہن نے سمجھی ہے۔ انتہی۔

حیات کی تمثیل پر جیسی حیرت ڈارون کے متبعین کو پیدا ہوئی ہے ویسی ہی حیرت نیوٹن کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے کہ اجسام میں جذب و انجذاب باہمی کا ضابطہ تو ایک پایا جاتا ہے لیکن یہ میں کس منہ سے کہوں کہ اجسام ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں جسم تو بے جان و بے حس ہے وہ بھلا کیا کھینچیگا۔ انتہیٰ

یہ حیرت پچھلے کی چاندنی ہے جس نے صبح کاذب کی طرح دھوکا دیکر طائر عقل کو وطن آوارہ و تباہ کر رکھا ہے ورنہ جو لوگ آنکھوں سے یہ دیکھ چکے کہ کیونکر حیات عالم غیب سے محل شہود میں آجاتا ہے یا اس نکتہ کو سمجھ چکے کہ قوت اس کے سوا کوئی اور شی نہیں کہ اوس سے علۃ حرکۃ مراد لیں یا یہ فیصلہ کر چکے کہ جسم بے جان بے حس چیز ہے کشش کا فعل اس سے خود نہیں سرزد ہو سکتا یا یہ جانتے ہیں کہ ہمارا دیکھنا سمجھنا سوچنا یہ سب فعل ہمارے اختیاری نہیں ان لوگوں کا وجود باری میں توقف کرنا یہی معنی رکھتا ہی کہ حواس ظاہری سی اوس کا ادراک نہیں حاصل ہوا۔ ورنہ خود ان کے نفس میں جو آثار احتیاج و افتقار کے موجود ہیں وہ باری تعالیٰ کا پتہ بتا رہے ہیں

لیکن محض وجود باری کا پتہ مل جانا کافی نہیں اصحاب توحید و تثلیث کا معرکہ اس کے بعد سر کرنا ہے۔ تمام حکمائے فرنگ اصحاب تثلیث میں ہیں اور جب ابطال تثلیث تک اون کا استدلال منجر ہوتا ہے تو موحّد ہونے کے بلکہ منکر وجود باری تعالیٰ ہو جانا اونہیں نہایت آسان معلوم ہوتا ہی پریسٹلی حکمائے انگلستان میں بڑا مشہور و سر برآوردہ ایک فاضل جلیل القدر گزرا ہے جو فن کیمیا کے بہت سے مسائل کو حل کر گیا۔ اوس نے اپنے موحد ہونے کا اظہار کر دیا۔ خلق خدا دشمن ہو گئی گھر کھدوا ڈالا۔ ساری کتابیں اور گراں بہا آلات اوس کے تباہ کر ڈیے۔ آخر مجبور ہو کر امریکہ میں جاکر ستر برس کی عمر میں ۱۸۰۴ء میں اس حکیم نے انتقال کیا۔ مصلحۃ ملکی کے

آسکے استدلال عقلی کا زور کچھ نہ چل سکا۔
وحدانیۃ باری تعالیٰ کا ثبوت بھی نفس انسان میں ہے۔ انسان کو بقائے شخص کے لیئے ہوا کی ضرورت ہے کہ سانس لے اناج کی احتیاج ہے کہ غذا کرے اس سے ثابت ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا اوسی نے ہوا کو اور اوس کے لیے غذا کو پیدا کیا۔ امیرالمومنین کے اس ارشاد سے کہ خالق النملۃ ہو خالق النخلۃ اُردو میں یوں کہیں گے کہ جس نے چیونٹی کو پیدا کیا اوسی نے شکر کو پیدا کیا وحدانیۃ خالق کی دلیل ظاہر ہے۔
جسطرح احتیاج انسان کی اپنے وجود میں ثبوت ہستی باری تعالیٰ ہے اور احتیاج انسان کی بقائے شخص میں ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ اسیطرح احتیاج انسان کی بقائے نوع میں بھی ثبوت وحدانیۃ باری تعالیٰ ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو بقائے نوع کے لیے عورت کی ضرورت ہے کہ اوس سے نسل چلے اور عورت کو اوس نے خود نہیں خلق کیا۔ غرض کہ عورت کی خلقۃ بھی وحدانیۃ خالق کی دلیل واضح ہے۔

علی حیدر طباطبائی

تاریخ سپارٹا میں لکھا ہے کہ جن دنوں میں وہاں یہ دستور تھا کہ ہر چھوٹا اپنے بڑے کو سلام کرے۔ ایک لڑکے نے جو سڑک پر جا رہا تھا ایک بزرگ کو آتے ہوئے دیکھا اور سلام نہ کیا بزرگ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اسکو پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے لیگیا مجسٹریٹ نے لڑکے سے پوچھا کہ تمنے کیوں نہیں اس بزرگ کے ادب کو محفوظ نہ رکھا لڑکے نے جواب دیا اس لیئے کہ مجھے معلوم ہی کہ اس بڈھے کا کوئی لڑکا نہیں ہی اس لیئے کہ اس نے شادی نہیں چونکہ یہ لاولد مریگا اور اپنے بعد کوئی لڑکا نہ چھوڑیگا جو میرے بڑھاپے میں مجھے سلام کرے اسکو اس سے حق نہیں ہی کہ یہ مجھ سے تعظیم کا متوقع ہو۔ مجسٹریٹ نے یہ عذر پسند کیا اور بڈھے کو نکالدیا ۱۲۔

حقوق نسواں

جون کے رسالہ تمدن میں جو مضمون "تمدن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ درحقیقت نہایت غور و توجہ سے دیکھنے کے قابل ہے گو قابل نامہ نگار نے آخر میں جا کر مضمون کو بہت سادہ اور مفید بنانے کوشش کی ہے اور اسمیں کلام نہیں کہ جو سوال پیدا کیئے گئے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ انپر بحث کی جائے لیکن تمام مضمون بلکہ ہر صفحہ ہر پیرا ہر سطر آئینہ ہے اس طرز معاشرت کا جسمیں ہماری عورتیں آجکل زندگی بسر کر رہی ہیں اور ثبوت ہے اس دعوے کا کہ عام نہیں بلکہ خاص اور خاص الخاص افراد قوم بھی اس طرز معاشرت کے ایسے عادی ہو گئے ہیں اور بیولینر حکومت کا چسکا ایسا پڑ گیا ہے کہ اب اسکا چھوٹنا آسان نہیں ٭

حامیان حقوق نسواں کی بابت قابل نامہ نگار کے اِن الفاظ سے کہ "اظہار قابلیت یا ذاتی نفع کی غرض سے ایسے مضامین رسالوں میں لکھا کرتے ہیں" ہمیں بحث نہیں کام کرنیوالوں نے اس سے بہت زیادہ سنا ہے ہاں بحث صرف مضمون کے اس حصہ سے ہے جس میں مولانائے موصوف نے حقوق کی تصریح کی ہے۔ اِس سے ہم اتفاق کر لیتے ہیں کہ مرد اور عورت کے درمیان فطری حق ایک ہی نہیں لیکن اب سوال یہ ہے کہ جب فطری حق ہے نہیں تو مرد کی فوقیت ثابت ہونی چاہیے تھی تاکہ عورتوں کے ذمہ یہ بار پڑتا کہ وہ خدمت کر کے اخلاقی حقوق پیدا کریں جس حالت میں کہ قدرت نے فریقین کے حقوق میں کوئی امتیاز نہیں

رکھا اور مرد کو عورت پر فوقیت نہیں دی تو ضرورت یہ ہے کہ مرد خدمت کرکے اخلاقی حق پیدا کریں۔ مولانا نے موصوف کا مضمون مکمل ہوتا اگر مولانا اس بات کے ثابت کرنے کی بھی کوشش فرماتے کہ مرد کو عورت پر کیا فوقیت ہے اگر ہماری رائے غلط نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دلیل قیاس مذہب کسی طرح بھی مرد کی فوقیت عورت پر ثابت نہ ہوگی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ قابل نامہ نگار نے مسئلہ کے اس پہلو کو ہاتھ نہ لگایا

مخالفہ حقوق نسواں سب سے بڑی دلیل مرد کی فوقیت کی اسکی وہ طاقت پیش کرتے ہیں جو قدرت نے جانوروں تک میں نر کو مادہ کے مقابلہ میں عطا کی ہے لیکن یہ دلیل اسوقت ٹوٹ جاتی ہے جب ہم بہت سے جانور ایسے بیان کرتے ہیں جنہیں نر اور مادہ میں بصورت ظاہری کوئی مابہ الامتیاز نہیں علاوہ ازیں طاقت وجہ فوقیت ہو بھی نہیں سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو طاقت حسن اس سے بہت زیادہ افضل و اشرف ہے +

مولانا صاحب نے چونکہ اس خاص معاملہ پر کچھ نہیں لکھا اس لیے ہم بھی اسکو خارج از بحث سمجھکر صرف ان واقعات پر بحث کرتے ہیں جو مولانا نے تحریر فرمائے مولانا کو نہ صرف یہ اعتراف ہے بلکہ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ مرد عورت میں کوئی فطری حق نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ بآسانی نکلتا ہے کہ مذہب نے دونوں کو دنیا میں اس غرض سے پیدا کیا کہ وہ تعلقات میں اخلاقی حقوق قایم کریں اور زندگی پر لطف بنائیں۔

ایسی حالت میں جتنا فرض عورت کا ہے اتنا ہی مرد کا بھی کہ وہ اخلاقی حق قایم کرنے کی کوشش کرے مگر اس بیوی کے واسطے زندگی کا وہ مجسم کیسا دردانگیز ہوگا جو علی الصباح نماز سے پہلے اٹھکر چولہے میں گھسی شوہر کے اٹھنے سے پہلے چار انڈے وتیرہ تیار کرے۔ نہانے یا منہ دھونے کو پانی

گرم کیا اور اس ڈر کے مارے کہ کہیں اٹھ نہ بیٹھیں چھپاک چھپاک ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر، کھانا پکانے پر پل پڑی مار امار کھانا پکایا دسترخوان بچھانا چاہتی تھی کہ باہر سے کسی نے آواز دی اور میاں صاحب جو یہ کہکر باہر گئے کہ تم کھانا نکالو میں آتا ہوں تو ساری دوپہر پوری شام اور آدھی رات نکل گئی مگر میاں ہی نہ پلٹے اس عورت کو کیا معلوم کہ میاں یار دوستوں کے مجمع میں اپنی آنکھیں سینک رہے ہیں اس کی آنکھیں دروازے ہی کو لگی رہیں عصر کی اذان کان میں آئی تو یہ خیال ہوا کہ صبح کا کھانا باسی ہو گیا دن بھر کے بھوکے تھکے ہارے آئیں گے ٹھنڈے چاول کیا آگے رکھوں جلدی جلدی سودا سلف منگوا مغرب سے پہلے پکا کر راہ تکنے بیٹھ گئی سب چیزیں پکا کر ڈھیر ہو گئے رات کا وقت ڈھنڈار گھر سنسان سماں دروازہ کھلا ہوا میں کھٹکے ہزار خوف اتنی مجال نہیں کہ محلہ کی کسی عورت کو بلا کر پاس کر لے یہ حکم نہیں کہ گھڑی بھر کو خود کسی کے ہاں چلی جائے آدھی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات اس ڈر سے کہ کہیں کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے انگیٹھی میں کوئلے دہکا۔ کھانا لیے بیٹھی رہی اتنا بڑا دن اور اتنی لمبی رات نیند کا جھونکا آگیا وہیں منڈیری پر پڑ رہی دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ میاں صاحب چرچر کرتے آدھمکے بیوی کو سوتا دیکھ تو آنکھوں میں خون اتر آیا آہستہ سے پکارا پہلی ہی آواز پر ہسار اٹھ بیٹھی اٹھنا تھا کہ حشر ٹوٹ گیا اس میں تو اتنی قابلیت تھی ہی نہیں کہ وہ حق پیدا کر سکتی اور یہ پوچھ سکتی کہ کہاں رہے۔ ہاں میاں میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ وہ عمر بھر حکومت کرتے اور یہ فرماتے کہ "جب مجھے تم سے اتنا آرام بھی نہ ملا کہ کھانا کھلا سکو تو تمھارے ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوا"۔

ہم نہیں جانتے کہ کونسے مذہب کس اخلاق اور کیسی عقل نے اپنے بخت
شوہر کو یہ حق دیا تھا کہ وہ بیوی سے آگر یہ توقع بھی رکھتا کہ اسکو کھانا تیار ملیگا۔
اسلام فریقین کی ساوات کو ان الفاظ میں ادا کر رہا ہے کہ "وہ تمہارا
لباس ہیں اور تم انکا لباس ہو"
اب رہا اخلاق اس سے بدتر اخلاقی گناہ اور اس سے ظالم اور جابر شخص
دنیا میں کیا ہوگا جو ایک شریف بھولی بھالی لڑکی کو ایسی لڑکی کو جو عزیزوں کو
دو بھر تھی نہ ماں باپ کے گھر کا کوڑا محبت کے وعدوں اور حسن سلوک کے اقرار پر
حقیقی عزیزوں سے تڑا اپنے گھر لایا اور برسوں کی رفیق ہمدم کے ساتھ یہ
قدر کی۔ گویا بیوی کا فرض صرف شوہر کی خدمت ہے۔
جسطرح انسان کی فطری حریت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اسی طرح
یہ بھی قابل بحث نہیں کہ انسانیت کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر یکساں ہے
روڈلوجیکل سرزمین مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں فزیالوجی اور علم تشریح
کی تحقیقات کا نتیجہ اس دعوے کا کافی ثبوت ہے پروفیسر مانجارا جو اٹلی کا
ایک زبردست عالم ہے لکھتا ہے کہ مرد کتنا ظالم اور خودغرض ہے کہ اسنے
علم تشریح تک میں اپنی مکاری کو ہاتھ سے نہ دیا اور یہ کوشش کی کہ عورت
کو اپنے مقابلہ میں انسانیت کا ادنیٰ درجہ دے صرف اس لیے کہ اسکو ان
حقوق سے محروم کردے جو وہ صرف اپنے واسطے مخصوص کرتا ہے اسکی
رائے ہے جبتک کہ عورت کو فطری حریت سے پوری طرح متمتع ہونیکا
موقع نہ دیا جائے۔ اسکی طبیعت کا فیصلہ کرنا یقینی غلط ہے۔
علمار انتھراپالوجی کے تمام علمار اس تحقیقات پر متفق ہیں کہ سوسائٹی کی
ابتدائی ساخت میں مرد اور عورت دونو برابر تھے بلکہ اکثر جگہ عورت افضل تھی

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ جو کامیابی رسالت میں قوۃ بازو رہیں اُنکی بابت پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مجھے خدیجہ کی زندگی میں کبھی کوئی دقت ایسی پیش نہیں آئی جسمیں اُسنے مجکو مدد نہ دی ہو۔

کم از کم مسلمان تو ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ مرد کی بڑی سے بڑی دقت میں بھی عورت کی اعانت اتنی ہو سکتی ہے جتنی زیادہ سے زیادہ کسی ملکی کی۔ اسپر بھی اکثر حضرات یہ ہی فرمائیں گے کہ عورت ناقص العقل ہے اور اسی وجہ سے مرد کو خدا نے عورت پر افضل کیا ہے تا کہ وہ بیوی پر حکومت کرے اور اس کی حریت کو سلب کرے۔

ہمیں نہایت ہنسی آتی ہے جب ہم ان بحثوں میں اکثر حضرات کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ قرآن صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں حالانکہ اِس آیۃ کا مفہوم صاف ہے کہ چونکہ قوائے فطری کے اعتبار سے مردوں کے فرائض عورتوں سے زیادہ ہیں اس لیے وہ عورتوں کے بطور کفیل کے ہیں اور انکا فرض ہے کہ جو کچھ وہ کمائیں وہ بیوی کے آگے ڈالدیں تا کہ وہ اپنے فرائض باحسن الوجوہ انجام دے سکے۔

خیر البحث یہ تھی کہ قدرت نے نہ مرد کو عورت کا غلام پیدا کیا نہ عورت کو مرد کا۔ صرف تحصیل معاش کے واسطے مرد کے قوا نسبتۃً مضبوط بنائے تھے لیکن ہندوستان نے اِس طاقت سے یہ کام لیا کہ عورت پر حکومت کرنی شروع کر دی۔ عورت چونکہ فطرتاً باعتبار طاقت مرد سے کمزور تھی اور تحمل طینت میں ودیعت تھا دبتے دبتے غلاموں سے بھی بدتر ہو گئی لیکن یہ مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بجار سڑک پر پھر رہا ہو اور کسی آتی جاتی بڑھیا کو ایک ایسی ٹکر دے کہ وہ غریب چاروں خانے چت جا پڑے یا ایک بندر کسی معصوم بچے کے ہاتھ سے

داغِ فرزند

آج اپنے، پرائے ہمسائے — کیوں نظر آرہے ہیں گھبرائے؟
ہیں! یہ خاموش کیوں ہیں سب کس طرح — کیا ہوا ان کو بیٹھے بٹھلائے؟
روح پرواز کر گئی شاید — ہائے اللہ کیا کیا جائے؟
طیبّہ طیبہ! کدھر ہے تو؟ — تیرا بابا تجھے کہاں پائے؟
کیا تجھے ماں کی اب نہیں پروا — سو رہی ہے جو پاؤں پھیلائے؟
ابّا کہہ کر گلے سے لپٹے کون؟ — کون گودی کو ہاتھ پھیلائے؟

وہ بھی کیا لوگ تھے! معاذ اللہ — اُٹھے اور زندہ بیٹی گاڑ آئے
ایک ہیں ہم کہ دل نہیں کہتا — لاش مٹّی میں داب دی جائے
ناز سے ماں کی گود میں جو پلے — اُف وہ آغوشِ قبر میں جائے!
دیکھے اے خاکِ گور سِل تجھے — داغِ حسرت کلیجہ پہ لائے

جب تری بھولی باتیں یاد آئیں — تیرے مکھڑے کا جب خیال آئے
صبر کیا آئے قلبِ مضطر کو — کوئی کس طرح دل کو بہلائے؟
ضبطِ گریہ میں کیا کروں ناصح — تیری آنکھوں میں اشک بھر آئے
جو نہ واقف ہو ذوقِ گریہ سے — مفت کیوں آ کے میرا سر کھائے
داغِ فرزند، کیا کہوں! اللہ — غیر کو بھی یہ دن نہ دکھلائے
ہائے کیا ہوک دل میں اٹھتی ہے — کاش سینے سے دم نکل جائے!

"وہ چھٹے ہم سے جسکو پیار کریں
جبر کیونکر یہ اختیار کریں"

آپ ہنسکر ہنسائے گا اب کون؟ — دل کا غنچہ کھلائے گا اب کون؟
تھی چمن کی بہار اس گل سے — دوسرا ویسا لائے گا اب کون؟
تھی اجالا اندھیرے گھر کا تو — یہ خرابہ بسائے گا اب کون؟
آہ گل ہو گئی وہ شمع خوشی — یہ دیا پھر جلائے گا اب کون؟
صبحکو آکے کھینچنی چادر — نیند سے یوں جگائے گا اب کون؟
دیکھتے ہی مجھے لپٹ جانا — دل سے یوں غم بہلائیگا اب کون؟
ہائے طفلانہ وہ رکوع و سجود — وہ تماشے دکھائیگا اب کون؟
جانتی تھی تو رنج کے تیور — آیا غصہ منائے گا اب کون؟
عمر ہی کیا تھی؟ دو برس اسمیں — یہ تو ہانت دکھائیگا اب کون؟
تو بھری گود کر گئی خالی — ماں کو تسکین دلائے گا اب کون؟
کانوں میں گونجتی تھی جو آواز — ویسی بولی سنائیگا اب کون؟

"دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں"

آہ میں آج ہو گیا برباد! — دشمنو لو تمہیں مبارکباد!
آہ اندھیر ہو گئی دنیا — کاٹے کھاتا ہے اب عظیم آباد
یاں کسی شے کا اعتبار نہیں — اس جہاں کی ہوا پہ ہے بنیاد
ہائے وہ عندلیب خوش الحاں — جس کے دم سے تھا یہ چمن آباد
آسماں تجھ پہ کیوں نہ ٹوٹ پڑا — لے چلا جب پکڑ کے او صیاد
توڑ دی کچی کلی جو لے گلچیں — کیا ملا اس سے او ستم ایجاد؟

دردِ دل کس سے میں کہوں جا کر — آہ لے جاؤں میں کہاں فریاد!
شے، نہ ملے، دیکھے لیلے لے دا آ، — تیرے شوگن ہیں اور ہو تو آزاد
اے خدا تیری ہی امانت تھی — تو نے لے لی اگر تو کیا فریاد؟
کون دم مارے فیصلوں پہ تری — اپنے سر آنکھوں پر، جو ہوا ارشاد
لب پہ آیا ہو حرفِ ناشکری — کی ہو بیتابیوں میں گر فریاد
درگذر کیجو اس سے ربِ عباد — ہم سے کیجو نہ باز پرس اس کی
کچھ تو اس میں بھی مصلحت ہوگی — ہوگا کوئی نہ کوئی اس میں معاد
ہے جو اعمال کی سزا مقصود — ہے جو تیری عذاب سے یہ مراد
یعنے دنیا میں جھیل لیں سب رنج — پرسشِ آخرت سے ہوں آزاد
جب یہی مصلحت ہے۔ یہ خوبی — صبر کر صبر اے دلِ ناشاد
بھول جا۔ یوں گناہ گار نہ کر — لب پہ آئے نہ شکوہ بیداد
اے سب سچ ہے کیا کروں لیکن — دل سے جاتی کہاں ہے اُسکی یاد

اشکِ خوں آنکھوں سے جو جاری ہے
بند کیا ہو۔ کچھ اختیاری ہے؟

دلِ ریش
محمد مسلم عظیم آبادی

---

(۱) وہ جو اپنے آباد اجداد کی تعریف کرتا ہے وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کوئی خوبی نہیں رکھتا
(۲) درحقیقت مالدار وہ ہے جو کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا اور غریب وہ ہے جو ہر شے کے حاصل کرنے کے در پے رہتا ہے۔
(۳) ہر رنج کے بعد خوشی کا ہونا ضروری ہے۔
(۴) ہمیشہ خوش رہنا عقلمندی کی نشانی ہے۔

بہن کا خط بھائی کے نام

(مرقومہ پروفیسر مشتاق احمد زاہدی۔ بی۔ اے)

بھائی جان! آپ نے اپنے خیالات کا جو اظہار اپنے محبت بھرے خط میں
کیا ہے میں بحیثیت ماں جائی ہونے کے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مگر آپ کے بہنوئی وہ
خط پڑھ کے بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ ظالم ظلم کو روا کہنے کے
لیے ایسی ہی دلائل پیش کرتا ہے جیسی شیطان برائی کا کام کرتے وقت"
جب چور چوری کرتا ہے تو وہ اپنے دلمیں نادم نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں کہتا ہے
کہ اگر میں چوری نہ کروں تو میرے ننھے ننھے بچے بھوکے مرجائیں۔ میرے
باپ دادا کے نام پر دھبا آئے۔ میری برادری میں میری آبرو نہ رہے
خدا مرنے کے بعد مجھ سے دریافت کرے گا کہ تو نے اپنے بچوں کو
کیوں بھوکا مرنے دیا۔ اور جس پیشے میں ہمنے تجھے اتارا تھا اس میں کیوں
نہ رہا۔ غرضکہ وہ اپنی چوری کرنے کو روا کرنے کے ثبوت میں وہ وہ دلائل
لائے گا کہ سقراط کو مات کرے گا۔ میری طرف سے آپ اپنے بھائی صاحب
سے پوچھیے گا کہ آپ کی یہ دلیل تو صحیح ہے کہ پولیس یا قانون کا قائم رکھنا
شریفوں کو چور سمجھنا نہیں ہے لیکن شریف اگر چوری کرنے لگیں تو پولیس
انکو بخشنے والی نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پردہ وہ کام نہیں دیتا جو پولیس
دیتی ہے پولیس انسداد جرائم کے لیے ہے اور خواہ کوئی چور ہو یا نہ ہو حفظ ماتقدم
ضروری ہے۔ آپ کے بھائی صاحب پردے کو حفظ ماتقدم بتاتے ہیں۔ لیکن یہ
کس قانون نے انکو اجازت دیدی کہ اس حفظ ماتقدم میں عورتوں کو قید کردیا

جائے۔ کیوں نہ یہ حفظ ما تقدم مردوں کے ساتھ کیا جائے جسطرح عورتوں کے بدچلن ہونے کا ڈر ہے اسیطرح مردوں کے بدچلن ہونے کا خطرہ ہے دونو اجناس میں سے ایک کو قید کر دیا جائے۔ آپ کے بہائیصاحب عورتوں کو قید کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مردوں کو پردے میں بٹھانا چاہیئے۔"

کیا عورتوں کو پردے میں بٹھانے سے مرد اپنی بد ذاتی سے باز آئے عورتوں کے پاؤں میں زنجیر پڑگئی مگر مرد تو اُن کے پاس پہنچ سکتے ہیں اور پہنچتے ہیں خواہ عورتوں کا لباس پہنکر اور ڈولی میں بیٹھکر کیوں نہ جانا پڑے

چور کو سزا دی نہیں جاتی اُلٹی اُس شخص کو سزا ہوتی ہے جس کے ہاں چوری ہوئی ہو کہ تو نے کیوں اپنے مال پر قفل مضبوط نہیں لگایا۔ شہر والوں کے لیے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ اپنا مال واسباب مقفل کر کے رکھدیں نہ کچھ پہنیں نہ کچھ برتیں ننگے پہریں اور بہوکے مریں اسوجسے کہ شہر میں چور ہیں چوروں کو نہیں روکا جاتا۔ وہ دترانہ شہر میں لوٹ مار کرتے پھریں۔

مرد عورتوں کو بہکائیں دہوکا دیں اور پھر خود ہی عورتوں پر فتوے دیا کہ انکو پردے میں رکھا جائے اور مرد مزے اُڑاتے پہریں کیونکہ وہ مرد ہیں چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد کھائیں اور غرائیں،

اگر عورتوں پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنی خوبصورتی سے مردوں کو لبھاتی ہیں اور اشتعال طبع دلاتی ہیں اس لیے انکو مردوں کی نظر سے دور رکھنا چاہیئے تو معاف کیجئے اگر میں یہ کہوں کہ عورت نما غیر جنس کو بھی پردے میں بٹھانا چاہیئے۔ کمسن لڑکے کم سے کم سولہ برس کی عمر تک پردے میں بٹھائے جانے چاہئیں۔ آپکے بہائیصاحب اس کے جواب میں شاید یہ کہیں گے کہ اگر لڑکوں کو پردے میں بٹھایا جائے گا تو وہ کمزور

ہو جائیں گے۔ انکی صحت خراب ہو جاوے گی وہ دنیا کے کاروبار کے لائق نہ رہیں گے یہ انکا فرمانا بجا۔ لیکن خواہ وہ کمزور ہوں۔ بیمار ہوں یا مرجائیں لیکن چونکہ ان کی عصمت بچانی سوسائٹی کا پہلا فرض ہے اس لئے اُن کی کسی تکلیف کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ انکو فوراً چوڑیاں پہنا کر عورتوں کے ساتھ پردے میں داخل کردینا چاہیئے۔ آپ کے بھائی صاحب اس خیال پر بہت ہنسیں گے اور مجھے باولا کہیں گے اور کہیں گے یہ کسطرح ممکن ہے کسطرح آزاد دنیا ان عورتوں کو پردے میں رکھنے والوں پر ہنستی ہے انکو باولا کہتی ہے اوران پر افسوس کرتی ہے کہ یہ اس ایک موہوم خیال کے پیچھے جس کی کامیابی نامعلوم ہے۔ اپنی نصف آبادی کو برباد کر رہے ہیں اور اپنی آیندہ نسلوں کے حق میں کانٹے بو رہے ہیں"

عورت کی عصمت کی محافظ پتھر کی دیواریں یا مرد کی نگہبانی نہیں ہوسکتی اسکی حفاظت صرف عورت کا دل کرسکتا ہے۔

مثل مشہور ہے رہے تو آپ سے . . . . اُس مرید تک جادوگر کا قصہ طوطا کہانی میں کس نے نہ پڑھا ہوگا جو ہاتھی نبکر ہروقت اپنی بیوی کو اپنے اوپر سے لئے پیرتا تھا اور ایک منٹ کے لیے اپنے سے جدا نہ ہونے دیتا تھا اسپر بھی اُس عورت کے ساتھ جو ہونا تھا سو ہوا۔ پردہ ایک غلط رسم ہے جسکو عصمت کی حفاظت کے ڈھکوسلے پر قایم کر رکھا ہے"!

اُن کا تو پھر لکچر شروع ہوگیا اور خدا جانے کب ختم ہوتا۔ لیکن میں یہ کہکر اُن کے پاس سے اُٹھ گئی کہ تم تو نیچری ہو۔

بہائی آپنے سچ کہا ہے۔ یہ نیچری مرد تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو تو پردے سے باہر نکال دیں اور خود پردے میں بیٹھ جائیں۔ اِن کا

یہ حال ہے کہ کہیں آنا نہ جانا ہر وقت گہر میں گہسے رہتے ہیں اور مجھے نصیحتیں کرتے رہتے ہیں کہ عورت نے اپنا وقار بہت گھٹا لیا ہے۔ اور مرد سے بہت دب گئی ہے۔ اور بغیر عورت کے اُٹھے کام نہ چلیگا۔ ورنہ ہم جیسے حقوق نسواں کے حامیوں پر مدعی سست گواہ چست کی مثل صادق آتی ہے بہائی جان عورت کی عقل تو گدی پیچھے بتاتے ہیں مگر میں آپ کے بہنوئی صاحب کی عقل پر حیران ہوں کہ اُن کا مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں اُن کا سامنا کروں۔ اُن سے نہ دبوں بازاروں کی سیر کرتی پہروں۔ اور مردوں کی طرح جو میرا جی چاہے کروں۔ یہ سب کہنے ہی کی باتیں ہیں اگر ایکدن میں اُن کی نصیحت پر عمل کروں تو حضرت خود ہی گہبرا جائیں۔ بہائی جان۔ آپ اُن باتوں سے گھبرا جائیگا۔ انکو یہ ایک مرض ہے۔ کہنے دیجے۔ اُن کے کہنے سے ہم پر یا آپ پر کچہ اثر تہوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہم کوئی ... تہوڑا ہی ہیں جو ایسی باتوں میں آجائیں گے ... جنھوں نے اپنے بچوں کو مذہب چھوڑ کر انگریزی تعلیم ہی دینی شروع کردی۔ ہم نے نہ اُسپر عمل کیا۔ نہ اسپر کریں گے کم سے کم شروع میں تو نہ کریں گے۔ جب دنیا بے پردہ ہو جائیگی۔ اور دوسروں کی عورتیں مردنا ہو جائیں گی تب دیکھا جائے گا۔ اُسوقت تک کون جیتا ہے۔ بہائی جان آپ ہراساں نہوں۔ ہمارے جیتے جی تو پردہ اُٹھتا نہیں۔

آپ کی بہن

مال دنیا کا نہیں ہے تو جہاں میں مستحق — ہو وہ دولت یا عمارت یا زمیں کا طبق
تجھکو آبادی دنیا سے فقط اتنا ملا — ہے ترے قد کے برابر اس زمیں میں شق احق

(ترجمہ قول حضرت علیؑ) عزیز لکھنوی

اشاعتِ اسلام

چند سال سے بنارس میں ایک انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے منعقد ہوئی ہے جس کے اغراض و مقاصد اسلام کے نمایاں واقعات پر فلسفیانہ نظر ڈالنا اور اون خیالات کی تردید جو اعتراض کی حیثیت سے اسلام پر وارد کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ امسال ۱۵-۱۶-۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو یہ جلسہ نہایت مہتم بالشان طریقے سے بنارس میں منعقد ہوا قریب قریب اکثر طبقہ اور مذہب کے لوگ اس میں شریک تھے آخری جلسہ میں یہ نظم پڑھی گئی جس سے حاضرین میں ایک نہایت جوش و خروش پیدا ہوا

ہے بنارس میکدہ اک رندِ دُردآشام کا   دیکھتا ہے صبح تک منظر طلائی جام کا
ہاں یہی تو وقت ہے دورِ مئے گلفام کا   دوڑتا ہے پھر تاہے رگ رگ میں لہو اسلام کا

انجمن میں ختم یہ دعوت طرب انگیز کر
عقل کے دریا ذرا ہاں اپنا دھارا تیز کر

محفلِ ملت میں پیہم دورِ ساغر چاہیئے   عقل کہتے ہیں جسے ساقی وہ جوہر چاہیئے
اور ہلکی سی شرابِ خواب آور چاہیئے   مجکو روحانی تعقل بندہ پرور چاہیئے

تا کہ دکھلا دوں جہاں کو اون حقائق کا اثر
جنتیں ہوں ذوقِ وجداں کی تری پیشِ نظر

کیا یہی شک فلسفہ مغرب کا بڑھکر چاہیئے   خونِ فاسد جوش زن ہے ایک نشتر چاہیئے
اب ہدایت کو کوئی اعجاز گستر چاہیئے   ہیں پیام ان کے بہت سے اک پیمبر چاہیئے

کیا فرائض ہیں ہمارے باخبر ہو جائیں ہم
اور دل سے بندۂ پیغام بر ہو جائیں ہم

ہوشیاری اس خبر سے اب کہ غفلت ہی میں ہیں　　　بے ترے مشکل بہت قطع مسافت ہی ہمیں
دشت غربت میں نبی کی خضر حاجت ہے ہمیں　　　عقل کہتی ہے پیمبر کی ضرورت ہے ہمیں

ظلمت شب کو ہے خواہش ایک شمع نور کی
ہے کلیم اللہ کو حاجت چراغ طور کی

کیوں الٰہی ہے زمین و آسمان کے تو طبق　　　کیا نہیں واضح ہوا اب تک یہ تجھپر امر حق
دیکھ بتلاتے ہیں یہ تاریخ کے روشن ورق　　　جب لیا ہر قوم نے اپنے پیمبر سے سبق

دین کی عزت ملی دنیا کو بھی حاصل کیا
وسوسے جو ذہن میں آئے اونہیں باطل کیا

کب ہوا اسلام رائج قوت شمشیر سے　　　بلکہ اخلاق حسن سے صلح جو تدبیر سے
موعظت سے پند سے الہام سے تقریر سے　　　نعرۂ تہلیل سے آوازۂ تکبیر سے

باطنی تھی اک کشش اون کے دل پر جوش میں
جذب روحانی تہا اوس کی کوشش خاموش میں

واعظ اسلام کے اخلاق ہیں سب آشکار　　　کافروں سے کیا کیا برتاؤ بعد از کارزار
تھا ہر اک مفتوح کو اوس وقت یہ قول و قرار　　　یا وہ جزیہ دے کرے یا دین احمد اختیار

قوت شمشیر اگر تھی کیوں کیا مختار اونہیں
اختیار جزیہ حضرت نے دیا بیکار اونہیں

تو ہی کہدے منصفانہ اے عرب کی سرزمین　　　سختیاں تجھپر رسول اللہ نے کیا کیا سہیں
ہوگئی جنبش تجھی اور کانپ اٹھا عرش بریں　　　کیسے استقلال سے تجھکو کیا زیر نگین

ذرہ ذرہ کو ترے جسنے منور کر دیا
جھولیوں میں تھے جو پتھر اونکو گوہر کر دیا

یہ سمجھ لو ہو بیاں کیا اوسکا خلق دلپذیر　　　جسکا ہر فقرہ ہے اک اخلاق کا گنج خط

[illegible]

مسٹر ابلیس

نمبر (۱)

وہ شیطان علیہ اللعن نہیں جو پرانے زمانہ میں لاحول کے وردوں سے دم دبائے گوشہ گوشہ چھپتا پھرتا تھا، جو اکثر منڈے ہوئے سر دراز ریش اور اونچے پائجامے کے ساتھ تقدس کا روپ بھرے ہوئے مسجد کے ملاؤں کے دل میں رات کی روٹی کی فکر پیدا کر کے نمازِ عشا کا خیال بھلا دیتا تھا؛ نہیں وہ نہیں، بلکہ وہ ابلیس جو نہایت کامیابی اور عیش کے ساتھ گذار رہا تھا، جو ہر سوسائٹی میں بلا روک ٹوک شامل ہوا کرتا تھا اور جو آئے دن نت نئی رنگتیں بدل کر اپنے حلقہ کامیابی اور دائرہ فتح کو بڑھاتا جاتا تھا!

عقل کا فرشتہ کہتا ہے کہ یہ ابلیس ہشتادم ہے: اور ہونا ہی چاہیئے کیونکہ قدرت کا واضع قوانین زمانہ کی رفتار اور ضروریات کو دیکھ کر، کم و بیش ہر صدی میں، ایک نئے ابلیس کے ہاتھ میں عنان شیطنت دیتا رہتا ہے!-

اس کی عمر، اور اس کی صورت؟ کچھ نہیں، اور سب کچھ! وہ اپنی قوت ابلیسی سے۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے لیے تاشبین قدرت کی طرف سے عطا ہونے والی قوت ابلیسی سے۔ آنِ واحد میں جس صورت اور جس سن کا چاہے نظر آسکتا ہے!

مسٹر ابلیس نے۔ ابلیس ہشتادم نے جو اپنا نام بغیر مسٹر کے استعمال کیے جانے کو سخت ہتک سمجھتا تھا اپنی توجہ، بیشمار ذریات کی طرف۔ دنیا کے

چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ذریات الشیاطین کیطرف۔ مائل کی؛ آناً فاناً، آنکھ بند کرتے ہی، اسے اپنی قوت پرطبیس کی مدد سے۔ ہویوگراف وائرلس ٹیلیگرافی، شعاع نور و برق تاباں، باد صرصر و تخیل دماغی، ان سب سے بدرجہا تیز اور سریع السیر قوت کی مدد سے، معلوم ہو گیا کہ اس کی ذریات اپنا مشکل کام عقل رکھنے والی انسان کی آنکھ میں اچھے کو برا اور برے کو اچھا دکھانے کا مشکل کام۔ نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے رہی ہے!

یہ دیکھ کر اسے جسقدر فرحت، جسدرجہ مسرت، ہوئی اس کا اندازہ یا تو وہی بازیچۂ اطفال کا تماشا دیکھنے والے کارپردازان قدرت کر سکتے ہیں یا خود مسٹر ابلیس ملعون کا دل۔ جولانگاہ خباثت دل۔ اچھی طرح جانتا ہوگا!

مسٹر ابلیس کی موجودہ کامیابی مسلم! اس کی روز افزوں ترقی تسلیم شدہ! لیکن اس کارخانۂ دنیاوی کے فانی ہونیکا خیال، ایک ناقابل بیان خلش پیدا کرنے والا کانٹا تھا جو رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا! یہ ہی بے چین کرنے والا خیال ہر موقعہ مسرت پر۔ دلم تر دیریں کسی نئے شکار کے پھنس جانے سے پیدا ہونیوالی عارضی مسرت کے موقعہ پر۔ مسٹر ابلیس کے دل و دماغ کے ساتھ، مسکن شیطنت دل و دماغ کے ساتھ، قدرت کے زوردار اور بے پناہ طمانچۂ غیبی کا کام کیا کرتا تھا! اسوقت بھی، خوش سمجھتے ہوتے، دفعتاً وہی خیال۔ اس تمام کائنات کے ایک نہ ایک دن درہم و برہم ہو جانے کا خیال۔ مسٹر ابلیس کے نخل مسرت و کامیابی پر بجلی کیطرح گرا، اور وہ چونک پڑا! وہ ٹھٹر اگیا، اور وہ کانپ اٹھا!

اس غیر معمولی اور اچانک خلش کا فوری علاج حسب معمول اس نے سامنے رکھی ہوئی بوتل سے۔ ہاؤس آف لارڈ کے لیبل والی سیاہ بوتل

کیا! آتشِ سیال کے ایک کناروں تک بھرے ہوئے گلاس سے اس کے دفعتہً پژمردہ ہو جانے والے دماغ کو پھر از سرِ نو مشتعل کر کے نمونۂ دوزخ بنا دیا اور وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا "اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر......" بس صرف اسی حرف تک پونہچکر وہ خاموش ہو گیا! کیونکہ وہ اُس کے بعد کا حرف۔ قادرِ مطلق کا نام جسکی ایک صفت قہار بھی ہے اپنی زبان سے نکالنے کی جرآت نہ کر سکتا تھا!

فوراً اُسے کسی خاص کام کا کسی پہلے سے سوچی ہوئی شیطنت کا خیال آیا، وہ کھڑا ہو گیا۔ در چلنے کی تیاری کرنے لگا اس سے پہلے اس نے اپنی طوقِ لعنت کو جو آٹھ ہزار برس سے یکے بعد دیگرے ہر نسل از واے شیطنت کے گلے کا ہار ہوتا آتا ہے نہایت احتیاط کے ساتھ چھپایا؛ اپنے متقدمین کیطرح اونی گلوبند یا شالی رومال باندھ کر نہیں چھپایا بلکہ چمکدار اسفید براق ڈبل کالر لگا کر چھپایا: پھر سر سے پاؤں تک انگریزی لباس پہنا اور نکل کھڑا ہوا اب وہ ہندوستان کے مشہور شہر...... کے ایک بازار میں جا رہا تھا! ایک خوبصورت ہلکی ہلکی کیمبر ولیٹ جسے ایک منہ زنگ عرب اُڑائے لیے جاتا تھا اُس کے پاس سے گذری، اس میں ایک جوان آدمی اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے اور ہیٹ لگائے راس ہاتھ میں لیے نہایت تمکنت کے ساتھ بیٹھا تھا مسٹر ابلیس نے پہلی ہی نظر میں معلوم کر لیا یہ حضرت کوئی جج صاحب تھے؛ نے کچھ زیادہ التفات نہیں کیا؛ کیوں ؟ محض اس وجہ سے ۔ لو خبیث مسٹر ابلیس کی ذریات میں سے ایک خاص لیے مغرور حضرات کو وہ اپنا خاص الخاص ، ۔۔ کوئی بگی میں کوئی گھوڑے

کوئی موٹر میں کوئی بائیسکل پر، اس بہرے پُرے شہر کے بازار میں اُس کے پاس سے گذر رہے ہے اور کوئی فرد بشر اُس کی ذریات کے حلقہ تزویر اور دائرہ فریب سے باہر نظر نہیں آتا تھا! اس لیے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ خود تکلیف گوارا کرتا، اور جو پہلے ہی سے اس کے ادنے کارپردازان شیطنت کے آگے گردن جھکائے ہوئے تھے، اُن پر کوئی سپہ چلاتا یا اُن کو رام کرنے کی کوشش کرتا!

مسٹر ابلیس سگار کے دہوئیں سے ہوا میں چھلے بناتا ہوا برابر آگے بڑہے جا رہا تھا اور اپنے معائنہ میں - اپنی ذریات کے اہم اور ذمہ داری کے کام کے معائنہ میں مصروف تھا: یہ اُسکا ہمیشہ کا معمول تھا - وہ ایسے ہی گشت لگاتا اور جہاں کہیں اپنے ماتحتوں کو - اپنی قوت تلبیسیہ کی عملی مشین - کے چلتے پرزوں کو غلطی کرتے یا کاہلی میں مبتلا، بلکہ یوں کہئے کہ، غلطی سے میں ناکامیاب یا کاہلی پیدا کرنے میں سست پاتا، تو فوراً اصلاح کر دیتا، ڈانٹ دیتا اور تاکید کر دیتا!!

یوں تو دنیا کا ہر نیک نہاد شخص بالعموم، مسٹر ابلیس کا مد مقابل، اور مسٹر ابلیس اُس کے پہلنے پہولنے یا آزار دینے کے درپے! لیکن جو بغض اور دشمنی مسٹر ابلیس کو بالخصوص مسلمانوں سے تہی وہ حد سے بہی تجاوز کر گئی تہی؛ اور کیوں نہ تجاوز کر جاتی، جبکہ وہ جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتہوں اُس کے متعدمین کو - گذشتہ فرمانفرمایان خباثت کو - مع اپنی بیشمار لشکر ذریات - فاش شکستیں ہوئی تہیں، اور صدیوں تحت الثرے تک راحت و اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا! مگر ایک عرصہ ہوا تھا: اپنے خون کے پیاسے ش

اور اوس کی ذریات نے، ایک ایسی ناگفتہ بہ حالت تک پہنچا دیا تھا کہ وہ گردن جھکائے، آنکھیں بند کیے، پستی کے غار کیطرف بڑھے جاتے تھے۔!!

اب پھر ایک موٹر مسٹر ابلیس کے برابر سے گذری: اس میں دو تین ہندوستانی عورتیں جلوہ فرما تھیں، جن میں غالباً دو ہندو، ایک یہودی، اور ایک مسلمان تھی!! یہودی لڑکی بقیہ تین سے عمر میں کم مگر حسن میں بدرجہا زیادہ تھی! یہ موٹر کچھ آگے بڑھکر ایک دوکان کے سامنے رُکی اور مسٹر ابلیس بھی فوراً اُس کے پاس پہنچکر ٹھٹک گئے! یہ سب کی سب کچھ سامان دیکھنے بھالنے میں مصروف تھیں، اور تمام راہگیر جو پاس سے گذرتے اُن کے دیکھنے کے لیئے ٹہرتے جاتے تھے!

کیوں ٹہرتے جاتے تھے؟ اس لیے کہ کمسن یہودی لڑکی شعلہ جوالہ! برق بلا۔ اپنے تبسم زیرلب سے غنچۂ ناشگفتہ کی تصویر کھینچ رہی تھی: اُس کی سیاہ اور کمر تک پہنچ کر ہوا میں لہرانے والی زلف دراز۔ عمر تسلسل اور لیلۃ القدر اپنے پیچ و تاب سے۔ مرگ سنبل کی خبر دے رہی تھی: اُس کی شوخ اور چمکتی ہوئی آنکھیں، اپنی نگاہوں سے۔ مست اور سرشار نگاہوں سے عقل و ہوش کے فرشتہ کو فنافی العشق کا چھلکتا ہوا جام پلا رہی تھیں: اُس کی پیوستہ اور گنجان بھنویں خنجر آبدار و کمان سخت۔ مژگانِ خمیدہ کی مدد سے پنجۂ شاہین تقدیر کی مدد سے۔ مرغ تدبیر کا دل نہایت آسانی کے ساتھ اُچک لیتی تھیں! مختصر یہ کہ، وہ کمسن نازنین اپنی خوبصورت ناک سے چشمۂ نور کی موج سے، اپنے نازک ہونٹوں سے۔ آب حیوان کے منہ میں پانی بھر لانیوالے ہونٹوں سے، اپنے صاف اور سرخ سرخ رخساروں سے۔ رشک وہ حور و غلمان گلاب کی پنکھڑیوں سے، اپنی نازک اور تنگ کمر سے۔ تکلیف دست اندازئی شوق کی

زندہ تصویر سے؛ اور سب کے آخر میں مگر سب سے زیادہ۔ اپنے علاج قوت بصارت سے؛ دیکھنے والوں کے دل پر، اور دل سے زیادہ ایمان پر، وہ وہ بجلیاں گرا رہی تھی کہ مسٹر ابلیس خوشی کے مارے آپے سے بے آپے ہوئے جاتے تھے۔ مسٹر ابلیس کو ایک حسین کمسن لڑکی سے جو بے پردگی کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ جو اپنے حسنِ زاہد فریب کے نظارہ سے نوجوان طبیعتوں کے دل میں شعلۂ جہنم مشتعل کر دیتی ہو۔ خواہشاتِ بد اور شرورِ نفس کی بیحد امید تھی! اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ خاندانِ ابلیسیہ کے بانی نے ملعون اوّل نے اپنے انتقام کی آگ کا شکار، ایک عورت ہی کے ذریعہ سے، آدم کو بنایا تھا!

وہ نہایت خوش ہوتا تھا، اُس کی قوتِ تلبیس جوشِ مسرت میں کرۂ نار بنجاتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ بے پردگی کی وبا مسلمانوں میں بھی پھیل رہی ہے: کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس خنجرِ عصمت کش کے سامنے اسلام کا طبقۂ نسواں۔ دامِ تزویر اور بدکاری کے جال میں کبھی نہ پھنسنے والا طبقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی راستبازی اور نیک نیتی کے ہتیار ڈال دیگا اور اپنے مردوں کو مسٹر ابلیس کا شکار بنانے میں قوتِ مقناطیسی اور کشش اجسام کا کام دیگا!!

موٹر چلا اور وہ کیوپڈ کی نورِ نظر یہودی لڑکی جو قامتِ دلنواز میں قیامت سے بھی ایک قدِ آدم زیادہ تھی، دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں کی نظروں سے حسنِ عالمگیر کی شمع پر گرنے والے انسانی پروانوں کی نظروں سے۔ ہلالِ عید کیطرح غائب ہوگئی: مسٹر ابلیس اس حسنِ گلوسوز کے اثرِ بد کا اندازہ کرتا ہوا، پردہ کے خیال میں متہمک، چل نکلا! پردہ اور بے پردگی کا

مقابلہ کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ سب سے پہلے اُسے پردہ کے رواج کی بیخکنی کرنی لازمی ہے: اُس نے طے کرلیا کہ وہ طبقۂ نسوان کے متعلق، اپنی ذریات کی تمام کوششیں پردہ کے برباد کرنے پر عصمت مآب کی مضبوط فصیل کے منہدم کرنے پر لگا دیگا، اور ضرور لگا دیگا!!

اب وہ ایک کوٹھے کے نیچے سے گذر رہا تھا، اوپر کے کمرے میں سے گانے اور ساز کی آواز آرہی تھی! مسٹر ابلیس نے یہاں ٹھہرنا ضروری نہ سمجھا بیشک قصر۔ تمام خوبیوں کو خواہشاتِ نفسانی اور مبلغ علیہ السلام پر سے قربان کردینے والا فرقہ، مسٹر ابلیس کا موردِ عنایاتِ خاص تھا! صرف یہ ہی وہ گروہ تھا جس کے لوکل اسلے الشیطان پیشہ کا کام۔ غارتگری اور تباہی کا کام۔ سالانہ رپورٹ میں مسٹر ابلیس کی تمام ذریات کے پرتلبیس کامیابی کے برابر نظر آیا کرتا تھا! وہ آگے بڑھے گیا اور گانے کی۔ قوت سامعہ کے ذریعہ سے دل و دماغ کو بندۂ جذباتِ نفس بنانے والے جادو کی سُریلی اور دلکش آواز برابر آتی رہی: فوراً مسٹر ابلیس نے کسی عمدہ شعر پر جو ہوا میں گونج کر اُس کے کان تک پہنچا تھا "مرحبا! آفریں! صد آفریں!! ابنیت کہا" شعر نہایت عمدہ تھا، اور مسٹر ابلیس اپنی خبث بھری طبیعت اور پُرفن دماغ کے زور سے اس شعر کے ایسے معنی تراشتا تھا جو شعر کے مصنف کو، شاعر مرحوم کو اگر سنانے جاتے تو غالباً وہ تمام عمر کے لیئے شاعری سے دست کش ہو جاتا! جو کچھ بھی ہو مسٹر ابلیس اس شعر کو بیحد پسند کرتا تھا، اور اب جبکہ وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، جبکہ گانے کی دلکش آواز اُس کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ اُس نے وہی شعر بشوقِ تبلیغ اور اشاعتِ الحاد کے جوش میں خود گنگنانا شروع کردیا.....

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

انقلاب تمدن

تڑپ، تڑپ، دل بیقرار تڑپ، اور ان صورتوں پر خون کے آنسوؤں سے رو جنھوں نے، آبادی چھوڑ، جنگل بسائے، ہوگئے اور ایسے داغ دیکر گئے، جو مدۃ العمر تازہ رہیں گے، عمر دنیا کہیں سے کہیں پونہچ جائے مگر آنکی یاد دل سے نہ جائیگی، آئندہ الازمانہ ان کے نام آنکھوں سے لگائیگا اور یہ فانی دنیا ان کی ہستی پر فخر کرے گی،

راتیں اور دن، ہیں تو ویسے ہی، مگر! وہ نہیں ہیں، ختم ہوگئے وہ دن، صبح ہوگئیں وہ راتیں، اور مٹ گئے وہ لوگ گذرشتہ سے برسوں پہلے کا وقت ہے اور زندہ ہیں وہ صورتیں جن کے قدم سرزمین جہان آباد آنکھوں سے لگا رہی دتی، بگڑ بگڑ کر بنی، اور بن بن کر بگڑی مگر پھر اس خاک سے ویسے لوگ نہ اٹھے یہ عالیشان محلوں، اور پکی محلسراؤں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کے گھر ہیں تو کچے دھابے اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، مگر لپے پتے، صاف ستھرے، لیونڈر کا تو انہوں نے نام بھی نہیں سنا مگر چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو انکی سادگی مذاق کا پورا پورا پتہ دے رہی ہے۔ انکے دماغ مغربی ہوا کے جھونکوں سے آشنا نہیں ہیں مگر آنکھیں، کبھی کبھی، ایک آدہ صورت ایسی ہی دیکھ لیتی ہیں، جو انکو ششدر و متحیر بنا دیتی ہے، ان کی صورت ظاہری لباس پوشاک وضع قطع نہ چنداں دلچسپ ہے نہ دلکش، قبہ دار ٹوپیاں۔ چغت دار انگرکھے، کمر میں پٹکے، ہاتھ میں عصا، جیب میں لمبے لمبے رومال، مگر، ان کے باطن پر کائنات کا

ہر ذرّہ درود پڑھ رہا ہے، یہ وہ لوگ ہیں پابندی وضع جن کی گھٹی میں پڑی ہی ہمدردی کے دودھ سے پہلے، اور خلوص کے آغوش میں پڑے رہے، لباسِ تعلقات پر، قولاً و فعلاً، ایسے پھول برسا گئے، جن کی خوشبو سے آج تک زمانہ مہک رہا ہے۔

یہ بھولی بھالی صورتیں، یہ سیدھے سادھے لوگ، جنھوں نے نمک کو، لون، اور چاقو، کو چکو اکہا، چندر روز کے مہمان ہیں، کان، ان کی آواز، آنکھیں ان کی صورتوں، اور دل، ان کی، باتوں کو ترسیں گے ملکہ مغرب کی سواری کا غلغلہ بلند ہو چکا، یہ وہ سیمتن ہے جس کے آگے زاہد صد سالہ سجدے کریں گے، اسکی ادائیں متقیوں کے دل بھی لوٹ پوٹ کردیں گی، انکی باتیں سنلو اور صورتیں دیکھ لو، پھر یہ کہاں اور تم کہاں، دیکھنا! دیکھنا! یہ پانچ برس کے دو چھوٹے ہوئے دوست ملے ہیں، سنو، سنو۔ ان کی باتیں سنو، اور یاد رکھو کہ محبت کا سکہ ان ہی کے دم تک اقلیم انسانیت میں چل رہا ہے، آگیا ہے وہ وقت، کہ مغرب کا دستِ شفقت اس تمدّن پر پانی پھیر دے۔

ہائیں! خلیفہ بندو؟ ارے بھائی کلیجہ سے تو لگ جا، صورت دیکھے مدتوں ہو گئے، سنجھلے احمد بیگ کیا مرے وہ طبقہ ہی الٹ گیا، میاں یوسف کی کالے کوسوں حیدرآباد پہنچے، ہمندی کو، چچا امیر بیگ کی نظر کھا گئی، ہائے، بندو کیا کڑیل جوان اٹھا ہے، دھیان آتے ہی کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے، آ بھائی ایک دفعہ اور مل، جی نہیں بھرا، ارے سینے ایک پانچ ہی برس میں ڈاڑھی بگلے کا پر ہو گئی، وہ ٹھونڑ قبضے کچھ بھی نہ رہے

بندو۔ آؤ میاں یوسف آ لڑے! اجب ہے نہیں سکتے کہیں ہوں آ رہے

تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ شہر کے شہر میں ہو اور اتنی خبر نہیں کہ بودی کو مرے تیسرا مہینہ ہونے آیا بیچارے کی ہڈیاں بھی گلگر خاک ہو گئی ہونگی کوئی ایسا ہی نصیبے کا دلی ہوگا جو دکن جا کر جیتا جاگتا پلٹا ہو تین کی سناونیاں تو ہم سن چکے ہیں بودی کا بیٹا لڑکا تو تمہیں یاد ہوگا اُس نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ سر اوٹھایا ہے کہ ماکو ناک چنے چبوا دیئے۔ دو ڈھائی آنے روز فقط بیٹھے بیٹھے ٹھونکو چاہیں وہ بیچاری مر کر صبح سے شام تک تین ساڑھے تین آنہ کی مزدوری کرکے اوس کا بھرنا بھرتی ہے۔ پرسوں پیسہ پاس نہیں تھا اسوقت کا جو نکلا ہوا ہے تو ابتک نہیں پلٹا سڑنوں کی طرح روتی پھرتی ہے صبح نماز دم دیکھتا کیا ہوں کہ کتدلی کی کھٹکھٹا رہی ہے میرا دل ہی دھکڑ دھکڑ کرنے لگا کہ یہ گھر دم خدا خیر کرے۔ اسکو گھر میں بٹھا کر جو نکلا ہوں تو یہ وقت ہو گیا۔ پہاڑ گنج۔ تیلی واڑہ۔ صدر بازہ شہر بھر چھان مارا مگر کہیں پتہ نہیں چلتا صبح سے نہار منہ ہوں اب کہاں ڈھونڈوں لوٹ کے جاتا ہوں تو خرابی اس بیچاری کو کیا منہ دکھاؤں گا اب یہ سنا ہے کہ بدرپور گیا سو بھائی وہاں جا رہا ہوں چھ کوس کی منزل ہے اور جھٹ پٹا ہو گیا۔ چلتے ہاتھ پاؤں ہیں جو کام ہو جائے اچھا پھر تو انکو کیڑے بھی نہیں کھائیں گے خدا دیکھتا ہے جو محبت بودی کے جیتے جی اُسکی اولاد سے تھی آج کے دم تک اسمیں فرق نہیں آیا میاں رشتہ نہیں ناطہ نہیں مگر برابر کا یار تھا اسکی بیوی دہاڑ دہاڑ روئے اور ہم بیٹھے بیٹھے سیر دیکھیں۔ تم سے ملکر جی خوش ہو گیا اب تو جانے دو اللہ چاہے صبح ہی آؤں گا +

یہ ہیں وہ دل، جو حاضر و غائب ایک، اور ظاہر و باطن یکساں! اس

جہالت پر علم سو دفعہ تصدق، اور ایسی بد تہذیبی پر تہذیب، ہزار بار قربان، مرے ہوئے دوست کی تصویر، جبتک زندہ رہے آنکھ کے سامنے رہے اپنا سکھ چین عیش آرام اس کے بچوں پر نثار کر دیا، کیا لوگ تھے کہ رانڈوں اور یتیموں کو وارثوں کی موت بھلادی مرگئے مگر وضع کو ہاتھ سے نہ دیا جس جنجال سے آخر وقت تک نباہ گئے، بیوقوف تھے یا جاہل جیسے بھی تھے اور جو کچھ بھی تھے۔ ایسے تھے، کہ یہ آسمان جو مدتوں ان کے سر پر چھایا رہا آج حسرت سے انکی قبر و نپر رو رہا ہے، اور یہ زمین جو انکو کلیجہ سے لگائے پڑی ہے، بآواز بلند یہ صدا دے رہی ہے کہ مادر گیتی کے بیر رو، تمھارے بعد تم جیسی صورتیں نظر نہ آئیں +

بندو اور آرٹے کی ملاقات کو دو برس سے زیادہ ہوگئے زمانہ سرعت کے پردں سے اڑا چلا جا رہا ہے، اور آناً فاناً نئے نئے انقلاب برپا ہو رہے ہیں مگر بسا غنیمت ہے یہ وقت بھی، کہ شرافت کے جوھر ہندوستانی تمدن میں اسی آب و تاب سے چمک دمک رہے ہیں۔

ملکۂ مغرب کا جہاز وسط سمندر میں اٹھکیلیاں کرتا چلا آرہا ہے اور مشرق اس شاہانہ جلوس کے انتظار میں چشم براہ ہے، دور کے ڈھول کے سہاونے، بچّہ بچّہ نئے مہمان کے آنے کی تیاریاں کر رہا ہے، مگر فلک پیر جس نے سیکڑوں قومیں اور بیسیوں ملک تباہ و برباد کر ڈالے، ان کی ناتجربہ کاری پر ٹھٹھے مار رہا ہے اسکی دوربیں نگاہیں تاڑ چکی ہیں، کہ مشرق آج جسکو ہنر سمجھ رہا ہے ایک سو ہی برس کے الٹ پھیر میں مغرب کی صحبت اس ہنر کو عیب اس فخر کو ذلت اور اس وضعداری کو بیہودگی بنا دے گی +

وہی دن ہیں اور وہی لوگ، مگر کیسے؟ وہ محبت کا خاتمہ اپنے ساتھ کر جائیں گے، اور زمانہ جن کا خلوص قیامت تک نہ بھول سکیگا۔

ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا! کرتہ میں تو گھنڈی تکمہ ہی ہے مگر آہا چلتے پھرتے وقت ہیں کہ چیل انڈا چھوڑ رہی ہے سر پر بوجھ ڈھوئے چلے آرہے ہیں، ان کی صورت دیکھ کر نحوست۔ ان کے گن دیکھو اور پھر کہو کہ یہ کیسی صورتیں ہیں،

غریب تین چار آنہ روز کا مزدور ہے مگر پڑھنے والوں کا کلیجہ کٹنے لگا جب یہ سنیں گے کہ اپنی مزدوری چھوڑ کر یہ گٹھری اُس بیوہ کے جو ہیں جس کے سر پر کوئی وارث نہیں، جو صبح سے بھوکی بیٹھی تھی جو اس تک رہی تھی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مجھے جو لادے تو پیس کر اپنا اور اپنے ننھے ننھے یتیم بچوں کا پیٹ بھر لوں۔

ذرا ان کا جواب بھی تو سن لو جب انہوں نے آواز دی ہے لو بہن اپنے جو لے جاؤ تو وہ بھوکی پیاسی جو صبح سے اللہ اللہ کر رہی تھی اٹھکر دروازہ پر آئی اسکی آنکھ دعائیں دے رہی تھی مگر جب اس نے زبان سے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے احسان کی کیا بات ہے

”حق ہمسایہ ماں جایہ“

لیجئے مغربی ملکہ آپہنچیں اُس وقت کو گذرے مدتیں ہوگئیں۔ انیسویں صدی کے دس برس نکل گئے آٹھے اور بڑے میاں جیسی صورتیں کبھی کی چھپ چکیں، آج مغربی تہذیب و تمدن کا دور دورہ ہے۔ مگر چشم بینا سے دیکھنے والوں۔ انصاف سے کہنا دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا

نوحہ

(ماخوذ از نظم انگریزی مطبوعہ دی اسٹوڈنٹ نمبر ۱)

اے دوست دم میں آہ کہ تو ڈھیر ہو گیا
افسوس قہر ہو گیا اندھیر ہو گیا

رخشندہ تجھ میں اب شررِ زندگی نہیں
وہ آب و تاب اور وہ تابندگی نہیں

سوزِ دروں نے یوں تو کیا تجھ کو لا کلام
یہ رنج کی جگہ ہے۔ یہ عبرت کا ہے مقام۔

بے حس پڑی ہے خاک تری میرے سامنے
چھائی ہے مُردنی رخِ تابندہ پر ترے

اب سرد و گرمِ دہر کا تجھ پہ اثر نہیں
افسوس میرے حال کی تجھ کو خبر نہیں۔

تو مایۂ سکونِ دلِ بے قرار تھا
سچ تو یہ ہے کہ تو ہی مرا غمگسار تھا

نعم البدل بتا کہ کہاں تیرا پاؤں میں
اب ڈھونڈھ کر کہاں سے بھلا تجھکو لاؤں میں

آزاد قید خانہ ہستی سے کیا ہوا
تو میرے دردِ دل کی طرح لاپتا ہوا

لذت پذیر صحبتی اب نہیں رہے
جو لطف تجھ سے دلکو تھے وہ اب نہیں رہے

فرقت میں تیری کسکو کروں دل سے پیار ہائے
انمول و بے بہا تھا تو میرے سگار ہائے

محمد سیف ... بی۔ اے

غزل

تغافل کی آنکھوں نے کیا دیکھا
ہائے کسی مصرف کا نہ رکھا

آنکھ ہے اور دیدار کی حسرت
دل ہے اور سودائے تمنا

آجتک آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں
ہائے! وہ پیارا پیارا جلوہ

رحم نہ کرنا ٹھیک نہیں ہے
دیکھ ستا کر تجھ کو نہ ملے گا

آہ! ترے اندازِ تغافل
کاش مجھی کو صبر آجاتا

دامن غفلت چھوٹ نہ جائے آنکھہ اوٹھا کر دیکھہ نہ لینا
شکوہ غفلت کس سے کیجے حرف شکایت کون سنیگا
زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے کاش! ترا ارمان نہوتا۔
صبر کبھی آیا ہے نہ آئے حسب عادت بھول نہ جانا
آہ ہماری ناؤ کی حالت موجیں حائل طوفاں برپا
آزاد! آپ اور قید علائق
مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولےٰ

حضرت آزاد۔سہارنپوری

بیاض ارشد۔مولوی رشید احمد صاحب ارشد تہانوی وکیل بہوپال کی ابتدائی مشق سخن کا مجموعہ جو حضرت قیصر ایڈیٹر الحجاب بھوپال نے تیار کیا ہے

حضرت ارشد کا نام ادبی دنیا میں نیا نہیں ہے ان کے کلام سے اردو کے اکثر مشہور رسالے مستفید ہو رہے ہیں۔ہمیں اُمید ہے کہ یہہ بیاض ملک و قوم میں وقعت سے دیکھی جائیگی اور شایقین سخن حضرت ارشد کی اس محنت کی دل کھول کر داد دیں گے +

کاغذ لکھائی چھپائی خاصی قیمت درج نہیں غالباً ارشد صاحب سے مل سکتی ہے۔

تعلیم و تربیت

تمدنی مسائل میں تعلیم کا مسئلہ ایسا ہے جس کے متعلق زبان و قلم سے بہت کچھ لکھا اور کہا ہے تاہم ہندوستان میں اوس کا اثر جیسا چاہیے ویسا نہیں ہوا۔ حامیان تعلیم جو عبارت ہے والدین یا اون سرپرست طلبار جنھیں تعلیم کے باب میں غور و فکر کا حق حاصل ہے اونہیں محسوس کرنا چاہیے کہ اس باب میں اون سے متعلق طلبار کے اون پر کیا حقوق ہیں او یہ ریمارک محض اون والدین پر ہے جو اپنے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ علم کے اصلی نقطہ کا ذوق شناس بنانا چاہتے ہیں۔ جن ماں باپوں کے خیالات یہ ہیں کہ اون کی اولاد ایک اعلیٰ نمونہ اون کے خاندان کے لیئے بنے۔ اون کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کی تعلیم اور بچوں کے اخلاق عادات کا اہتمام لیا کریں بچپن ہی سے بچوں کا نشو و نما اور اون کا اٹھان اون کی نظر میں رہے۔ اور اون کی کسی غلطی پر گرفت کا موقع اونہیں ڈھونڈھنا نہ پڑے۔ بلکہ خود بخود اپنے سامنے آ جائے غالباً کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ والدین اپنے بچوں کے ہر فعل کے ذمہ دار رہیں ہیں اور اون کا سچا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کا چال چلن بچپن میں ایسا عمدہ بنا دیں کہ مرتے وقت تک اون کے بچے اوس پر قایم رہیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اون کی صحت کا بھی خیال رکھیں اور ساتھ ہی اون کے دلوں میں بخوبی اس بات کو بٹھا دیویں کہ وہ صرف والدین کی اطاعت کے واسطے ہی نہیں ہیں بلکہ اون پر خاص و عام کے حقوق اور ملک کی

ذمہ داریاں ہی ہیں جنکا سامنا اونکو اپنی آیندہ زندگی میں کرنا پڑے گا۔ ان سب کے بعد بچے خود اس امر کے جوابدہ ہونگے کہ لاپروائی یا اعتنائی قلب سے وہ اپنے فرائض متعلقہ کو ادا کر رہے ہیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کو تین چار سال کی عمر میں ناسمجھ اور ناقابل تعلیم و تربیت سمجھکر اون کی تعلیم و تربیت کی طرف سے لاپروائی کرتے ہیں۔ مگر یہ بات قابل افسوس ہے کیونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اسبات کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی تعلیم خود شروع کر دیتا ہے۔ اور ماں باپ کی نظر اور آواز کا لہجہ ہر ایک شئے اوسکو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔ جو اوس کے آیندہ زندگی پر بہت بڑا اثر پیدا کرتی ہے دیکھو عقلمند جاپانی مائیں اسبات کو محسوس کرتی ہیں اور بچہ پیدا ہوتے ہی اوس کی تعلیم و تربیت شروع کر دیتی ہیں۔ مگر افسوس ہمارے ہندوستان کی جاہل مائیں اسبات سے بالکل بےخبر اور لاپروا ہیں۔ اور جب کبھی تعلیم کا ذکر آتا ہے تو کہتی ہیں۔ کہ چشم بد دور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ لکھ لیں گے جلدی کیا ہے خدا عمر تو دے۔ اور جب صاحبزادے خدا خدا کر کے آٹھ دس برس کے ہوئے تو میاں جی نوکر ہوئے اور بچہ کی تعلیم بعد ادائے قاعدہ سے شروع ہوئی۔

اسیطرح شروع سے جو چال چلن بچہ کا ہو گیا۔ ہو گیا۔ خواہ اچھا ہو یا برا ہو جیسی افتاد پڑی بعد سے عمدہ صحبت ہی اپنا خاطر خواہ اثر نہیں جما سکتی والدین کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی قابلیت کو سمجھیں اور دیکھیں کہ اونکو کس مضمون سے زیادہ رغبت ہے۔ اور کس مضمون میں وہ ترقی کرنے کے قابل ہیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ صحبت بھی چال چلن پر بہت بڑا اثر

کرتی ہے۔ اِس لیئے اونہیں بُری صحبت سے بچاویں۔ ہم تین چار سال کے عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ماں کو قرار دیتے ہیں کیونکہ اُسوقت کا چال چلن دل پر ایسا نقش ہوجاتا ہے کہ بغیر تبدیلی کے ہمیشہ قایم رہ سکتا ہے۔ کیونکہ ماں بچہ کے جذبات کو اعتدال پر رکھتی ہے اوسکی بہوک کو روکتی ہے اوس کی خواہش کو درست کرتی ہے۔ اور اوس کے دل پر قابو حاصل کرتی ہے اور ایک نہایت عمدہ اور نیک چال چلن و الاڑکا بناو یتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کام استاد کا ہے اور اس کا جوابدہ استاد کو ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ بالکل صحیح نہیں کیونکہ بچہ کی نگہداشت صرف تہوڑے عرصے کے لیے استاد کے ذمہ کردی جاتی ہے۔ جب لڑکا اسکول جاتا ہے۔ اور جب وہاں نئے لوگوں سے ملتا ہے۔ نئی سوسائٹی میں شریک ہوتا ہے۔ تو والدین کے فرائض کا دائرہ اور بھی وسیع ہوجاتا ہے۔ والدین کو بچوں کی تعلیم صرف اسکول ماسٹر پر ہی نہ چھوڑ دینی چاہیئے۔ اور اسکول بھیجکر اپنے تئیں ذمہ داری سے سبکدوش نہ سمجھنا چاہیئے۔

انکو یہہ بھی چاہیئے کہ بچوں کے سامنے اون کے استاد کو برا نہ کہیں۔ بلکہ بچوں کو ہدایت کریں کہ استاد سے اور اپنے ہم جماعتوں سے محبت کریں۔ اور ہر ایک کو اوس کے مرتبہ کے مواقف سمجھیں۔ اگر بچہ میں انتظام کی قابلیت ہے تو وہ اسکول کے انتظام کے قایم رکھنے میں استاد کا ہاتہ بٹاوے گا۔ لیکن اگر انتظام کی قابلیت نہیں ہے تو اسکول میں بدانتظامی ہوگی۔ اسوجہ سے یہہ کہا جاتا ہے کہ والدین اور استاد دونوں کو بچوں کی ذہنی اور عملی تعلیم میں اجتماعی

کوشش صرف کرنی چاہیئے بعض والدین اکثر استادوں کی تعلیم و
تربیت کی شکایت کرتے ہیں اور ایک معنے کرکے اوستادوں کی
ناقابلیت کا پہلو دکھلاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے بچوں کی عملی ناکردارئیوں
لحاظ نہیں کرتے جو استاد کی چشم حفاظت سے علحدہ ہوکر طرح طرح
کی اخلاقی گستاخیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جن کی نگہداشت کا
پورا بار والدین پر اور درصورت اون کے بورڈر ہونے کے نگراں
بورڈنگ پر ہے۔ جسکا زہریلا اثر ایک بورڈر سے دوسرے بورڈر تک
پہونچنا لازمی ہے۔ خانگی زندگی کے ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کے دلونکو
علم کیطرف مائل کرنا چاہیے۔ جو ایک شفیق اور عقلمند ماں کا فریضہ ہے
اکثر والدین خصوصًا مائیں محبت مادری کے جوش سے بچوں کو گھر میں
بٹھالیتی ہیں اون کو ایسا نہ کرنا چاہیئے اور روزانہ اسکول بھیجنا چاہیے
جب اسکول میں تعطیل ہوجائے تو بچوں کو اخبارات اور کتابوں کا مطالعہ
عام لکچرس میں شریک ہونے دلچسپ مباحثے اور اسیطرح دوسرے طریقوں
سے والدین کو چاہیئے کہ اون کے معلومات کا دائرہ وسیع کرنے
کی طرف اونہیں راغب کریں اور اون کے دلوں میں مطالعہ کا شوق
علم کا اصلی مذاق پیدا کریں۔ اون کو چاہیئے کہ وہ خود بھی علم سے
محبت کریں اور اوس میں خوشی محسوس کریں اگر وہ ایسا نہ کریں گے
تو کس طرح اپنے بچوں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ کریں گے۔
کیونکہ جب اون کے بچے علم سے بے بہرہ ہوں گے اور اونکو علم سے
دلچسپی مذاق نہو گا۔ اونمیں اونہیں مسرت حاصل نہو گی تو وہ ذلیل سوسائٹی
میں پائے جائیں گے جو کہ بُرے کاموں کا مخزن ہے اور بُرے کاموں کی طرف

رہنمائی کرتا ہے۔ اگر بچوں کو بری برائی سے محفوظ رکھا جائے اور اونکو عمدہ تعلیم دی جائے اور ایسا قابل بنایا جائے کہ علم کا اصلی چٹخارہ وہ اپنے ذہن دماغ میں پاویں تو وہی بچے جو جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا شکار رہا ہوتے ہیں دنیا کے واسطے نمونہ ہوں اور مثل تاروں کے شہرت کے آسمان پر چمکنے لگیں گے۔ نوجوان عارضی اور ناپائدار مسرت کی طرف زیادہ رغبت کرتے ہیں۔ اوسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اون کی کشت زار خیالات میں علم کا بیج نہیں بویا گیا۔ اور وہ علم سے بالکل بے بہرہ ہیں وہ نہیں جانتے کہ علم کا مزا تمام دنیاوی مزوں سے اچھا اور مسرت بخش ہے جو مطالعہ کی عادت ڈالنے سے سب مزوں پر غالب آجاتا ہے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو غور و فکر کی عادت سکھادیں۔ اور ایسے کھیل سکھادیں جن سے کوئی دماغی یا ذہنی فائدہ ہوسکتا ہو تو وہ آگے چلکر بجائے کھلاڑی ہونے کے غیور اور فکر کن آدمیوں کی تعداد اپنے وطن میں بڑھانے کا باعث ہوں گے۔ اور بچوں کو اسباب سے منع کردینا چاہیئے کہ وہ اپنا قیمتی وقت مخرب اخلاق ناولوں اور بے سروپا قصوں کے مطالعہ سے نہ ضائع کرسکیں کیونکہ وہ خراب اثرات ہیں جو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں چھپے ہیں۔ بلکہ وہ اپنا قیمتی وقت مستند اور مشاہیر مصنفین کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کریں یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا تعلیم میں روپیہ کا زیادہ خرچ ہے اور کیا یہ معمولی دولتمندی کے امکان سے باہر ہے۔؟

جسکا جواب میں نہایت زور کے ساتھ نفی میں دونگا۔ کیونکہ آج کل عمدہ کتابیں نہایت ارزاں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں۔ تمام بڑے

شہروں میں عام کتب خانے اور لائبریریاں موجود ہیں جہاں ہر زبان کا نہایت عمدہ لٹریچر ہر وقت موجود رہتا ہے جس سے ہر خاص و عام مستفید ہو سکتا ہے۔ اپنے ماں باپ کا ایک ایسا بچہ جو نیک اور لایق ہے۔ اور جس کے دماغ میں علم کا بیج عمدگی سے بویا گیا ہے وہ صرف آپ ہی خوش نہو گا۔ بلکہ وہ تمام اپنے زیر اثر لوگوں کو بھی خوش کریگا والدین کے واسطے یہ بات کسقدر باعث مسرت ہوگی۔ جب وہ اپنے بچوں کو لائق قابل اور صرف آپ ہی خوش نہیں بلکہ اپنی ملاقات سے دوسروں کی خوشی کو بڑھاتے ہوئے دیکھیں گے۔ اور لوگ اون سے ملنے کی تمنائیں کریں گے مگر کسقدر غم اور صدمہ ہوگا۔ جب اونکو جاہل مطلق۔ اور زندہ مصیبت زدہ اور دوسروں کی خوشی میں خلل انداز ہوتے ہوئے دیکھیں گے کاش ایسے والدین جو بعد کو غم و الم و مصیبت کی تصویر بن جاتے ہیں۔ پہلے سے اپنے بچوں کو پڑھانے لکھاتے۔ اور شروع سے زیادہ لاڈ اور پیار نکرتے اور اون کی عادات و خصائل کو خراب نہ کرتے تو کیوں پھر روز بد اون کو دیکھنا نصیب ہوتا۔ بعض لوگ اس امر پر سنجیدگی سے بحث کرتے ہیں۔ کہ بچوں کی تعلیم یہ ایک ملک کا فرض کیسے ہے؟ اسکا جواب نہایت صاف موجود ہے۔ کیونکہ تعلیم اونکو ہوشیار کار آمد اور آرزو پسند شہری بناتی ہے اور ایک آزاد آدمی کو عقلمند آدمی ہونا چاہیے کیونکہ پولیٹکل آزادی کی بنیاد عقلمندی پر قایم ہے اور نیکی و عقلمندی اوس کی حفاظت کرتی ہے ۔ ہم ایک نہایت سنجیدہ گورنمنٹ کے زیر سایہ میں ہیں اور گورنمنٹ کی خواہش یہ ہے کہ شہری نیک اور عقلمند ہوں اور ہم بغیر اس کے ترقی نہیں کر سکتے جو لوگ یہ خواہش کرتے ہیں کہ

اپنے ملک کے حقوق قایم رکھیں اور آزادی تعلیم سے فائدہ اُٹھاویں اور اپنے ملک کے عزت و وقار کو بڑھاویں اونکو چاہیئے کہ وہ اپنے بچونکو عمدہ تعلیم دیں۔ دیکھو جاپان۔ امریکہ جرمنی۔ انگلینڈ تمام اس طریقہ میں نمونہ ہونیکی کوشش کر رہے ہیں یاد رکھو کہ اصلی مسرت اور سچّی خوشی اوس دل و دماغ کے واسطے ہے جو علم سے بنایا گیا ہو۔ بچوں کو اصلی اور سیدھے رستہ پر تربیت کرو۔ تاکہ وہ دنیا کے واسطے بہت کچھ کر سکیں ورنہ وہ امن و امان کو برباد کریں گے۔ لڑائی جھگڑے پیدا کریں گے۔ کیونکہ وہ جاہل مطلق ہوں گے اور اون کے دماغ علم سے ناآشنا ہوں گے خیر جو نتیجہ ہو خواہ اچھا یا بُرا وہ بہت دور تک پہیلے گا اور مرتے دم تک قایم رہے گا۔ اس نتیجہ کے ذمہ دار کون ہوں گے! والدین

سیّد سجادت حسین۔

شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی بیوقت موت اور منشی

امیر اللہ صاحب تسلیم کے انتقال سے جو نقصان زبان اُردو کو پہنچا مشکل ہے کہ اب اسکی تلافی ہو سکے جو جا رہا ہے اُسکا نعم البدل پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دونو بزرگوں کے حالات جو قوم کے واسطے مایۂ ناز تھے مع تصویر کسی آیندہ پرچہ میں درج کریں گے +

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھکو
شکوہ اللہ سے ۔ خاکم بدہن ہے مجھکو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟
ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھکو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہل چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی!
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی!

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی!

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے!

تو ہی کہدے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا اُسکو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟
کاٹ کر رکھدیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کسنے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟
اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کِسکی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟
کِسکی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کسکی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
مُنہ کے بل گر کے ھُوَ اللّٰہُ احد کہتے تھے!

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہو
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کو
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!
تری سرکار میں پہنچے تو

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لیکر صفت
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجکو کبھی
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انسان کو غلامی سے چھڑ
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگا
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہ

امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں — عجز والے بھی ہیں مست مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں — سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر — برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے — ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں — اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں، ہیں انکے خزانے معمور — نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور — اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں! — بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں!

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب — تیری قدرت تو ہے وہ جس کی کوئی حد نہ حساب
تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب — رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے — کیا ترے نام پہ مرنیکا عوض خواری ہے

ی اب چاہنے والی دنیا — رہ گئی اپنے لیئے ایک خیالی دنیا
ہم اوروں نے سنبھالی دنیا — پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا
تم ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے — کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

ی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے — آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
شاق گئے وعدۂ فردا لیکر — اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

، وہی قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
ل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — امت احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی
یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟ — اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا ؟
بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا ؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا ؟
رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا ؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاران پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمیِ رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے
پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ سے جلنے کیلئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لیگئی بیرونِ چمن رازِ چمن | کیا قیامت ہی کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن | اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک! | اُسکے سینے میں ہی نغموں کا تلاطم اب تک!

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں | پتیاں پھول سے جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں | ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اسکی | کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اسکی!

لطف مرنے میں ہی باقی نہ مزا جینے میں | کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں | کسقدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں | داغ جو سینوں میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں | جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں | پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہی مری
نغمہ ہندی ہی تو کیا لے تو حجازی ہی مری

اقبال

رباعی

بے لطف شباب سے پیری اچھی | آزادیِ مطلق سے اسیری اچھی
بگڑی ہوئی شاہی کی خرابی کو نہ پوچھ | اس سے تو بن آئے کی فقیری اچھی

"انیس"

ضمیرہ

گذشتہ سے پیوستہ

سو پچاس نہیں تو دو ایک صورتیں آج بھی ایسی موجود ہیں جن کی آنکھوں نے ضمیرہ کو دیکھا اور اوس وقت دیکھا جب مرض محبت اور خلوص کی بیماری اسکو شروع ہو چکی تھی۔ پیہم صدمات اور متواتر تفکرات نے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا لیکن قدرت کا وہ انعام جو حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے اسوقت بھی دور دور اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

حسن کی دیوی پیکر انسانی میں آسمانی حور جسکی صورت پر نور اور باتوں سے پھول برستے تھے صدمۂ فراق کی زیادہ تاب نہ لاسکی برسات کے موسم میں کالی بھنور راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی بادل گرجتا اور وہ ضمیرہ جو دن دہاڑے اکیلے کمرہ میں جاتے ڈرتی تن تنہا چھت پر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رات گذار دیتی۔ مور جنگھارتے پپیہا بولتا۔ ٹیٹری الاپتی اور ضمیرہ کا دل مجروح چچازاد بھائی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر صبح کر دیتا۔ آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑیاں لگاتیں کلیجہ ہاتھوں اچھلتا اور خیالات اُن اُن مقامات تک پونہچا دیتے جہاں کبھی امید کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زار دکھائی دیتے اور کبھی ان پر اوس پڑ جاتی رات دن تفکرات کے دریا میں غوطہ کھاتی ڈوبتی اور ابھرتی بیٹھتی اور نکلتی۔ چچا کا گھر جیل نہ تھا۔ جہاں فراق احسن کی زبردست زنجیریں اس کے پاؤں میں تھیں۔ جو دم بھر اسکے نے کی اجازت نہ دیتیں۔

(۶)

آسمان نے کروٹیں لیں، زمین نے موسم پلٹے! برسات گذر کر گلابی جاڑا آپہونچا تھا۔ کہ ضمیرہ کو واپسی کا حکم پونچا۔ وہ چہرہ جسپر مردنی چھا گئی تھی سنتے ہی کھل گیا اور وہ دل جس کی آرزوئیں مرچکی تھیں اوچھل پڑا۔ جسکی انتہائے کامیابی صرف اس بھائی کی صورت دیکھ لینی تھی جو مدتوں ساتھ کھیلا اور جسکو بچھڑے اب [illegible] گذر گئے تھے اس کی حالت اسوقت دیکھنے کے قابل تھی جھٹ پٹا وقت ہوگا کہ ضمیرہ کی گاڑی مکان کے پاس پونچی چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر وہ صورت نظر نہ آئی اِس بدنصیب کو کیا معلوم کہ آج سنگدل باپ اسکی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیگا اتری اندر گئی اور بیٹھی ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ باپ کے یہہ الفاظ اِس کے کان میں پونچے صبحکو تمھارا نکاح اسلم سے ہے۔

ہائے یہہ پیروں میں سنسنی اور تمام بدن میں یہ سنتے ہی ایک سناٹا آگیا، باپ کا نادرشاہی حکم جس نے زندہ کو مردہ بنا دیا ضمیرہ بدنصیب کی آئندہ زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی کے پچھلے ورق میں کبھی کبھی کامیابی کا حرف امید دکھائی دے جاتا تھا لیکن اسوقت تھوڑی یا بہت جتنی بھی امیدیں تھیں وہ خاک میں مل گئیں آنکھیں نیچی تھیں اور سنگدل باپ کی تجویز پیش نظر۔ گھنٹوں اسیطرح ساکت بیٹھی رہی۔ باپ چلا گیا گھر والے پڑکر سو گئے تو وہ حسرت نصیب دل جسپر جسپر کے پرچے لگ رہے تھے قابو میں نہ رہا آنے والی مصیبتوں کا یقین۔ احسن جیسے رفیق کی نعمت زندگی [illegible] بربادی اور باپ جیسے شفیق کی بیدردی۔ تیر تھے کہ کلیجے [illegible] ہے تھے۔ گاؤں سے چلی تو یہ امید لے کر چلی۔ گاڑی

اتریں تو یہ یقین لے کر اتریں کہ کان جس کی باتوں کو ترس رہے ہیں آنکھیں اسکی صورت دیکھیں گی آپ جسکی ہمدردی کی محتاج ہے دل اسکی عنایت سے بشاش ہوگا۔ مگر منزل مقصود پر پہونچی تو نہ وہ مدعا تھا نہ غرض۔ ناامیدی کا دریا زور شور سے لہریں لے رہا تھا اور مایوسی کے ابر جھوم جھوم کر برس رہے تھے کیسی قیامت خیز رات تھی جس [illegible] کروٹ چین نہ دیا وہ جانتی تھی کہ صبح کی اذا [illegible] ہے خدا دشمن پر بھی یہ مصیبت نہ ڈالے جو [illegible] تو اس صدمہ کا سامنا تھا ان بیسیوں رشتہ داروں میں [illegible] کی زندگی میں صدقے اور واری جاتے تھے ایک بھی ایسا نہیں جو اسوقت میرا ساتھ دے اور اس مصیبت سے بچائے ابا جان اپنی عقل کے ناخن لیں۔ میں اس ماں کی بیٹی ہوں جس نے اپنی ضد پر آکر بیس ہزار کی جائداد کو آگ لگا دی اور سگے بھائی کی مرتے مرتے صورت نہ دیکھی اسلم کی تو مجال کیا ہے کہ میرا آنچل دیکھ لے اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین پر اس طرح قربان ہوں کہ سننے والے واہ واہ اور دیکھنے والے آہ آہ کریں۔ مگر جب مرنا ہی ٹھیرا تو گمنامی کی موت کیوں مروں اس طرح مروں کہ میری موت دوسروں کے واسطے عبرت اور ماباپوں کے لیے ایک نصیحت ہو۔

اتنا کہکر ضمیرہ نے قلم ہاتھ میں لیکر اسطرح لکھنا شروع کیا،

"اس بدنصیب بیٹی کی طرف سے جو اب چند گھنٹوں کی مہمان ہے باپ کو آخری سلام۔

اس دنیا میں جس کی بہار مجھے دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بیٹیاں بہت سی ہوئیں اور ہو ہو کر مریں ہیں اور رہ رہ کر مریں گی ہونگی اور بس بس کر اجڑینگی

فرمانبردار اور نافرمان رحمدل اور کٹر۔ غرض دنیا ہر قسم کی بیٹیوں سے بھری رہی بھری ہے اور بھری رہے گی مگر وہ بیٹی نافرمان نہیں جس نے اف نہ کی۔ تیوری پر بل نہ لائی۔ نگاہ اونچی نہ کی اور ایک نہ دو سات بلکہ آٹھ سال اس گھر میں بسر کر دیے جہاں زندگی کا ہر لمحہ مصیبت تھا جہاں تن ڈھانکنے کو چیتھڑا ... نصیب نہ ہوا مصیبتیں جھیلیں دکھ بھگتے ایذائیں ... سگے چچا کے گھر میں جنہیں ... سے کے روز سے نون کی ... مگر یہ آسمان جس کے نیچے بیٹھی ہوں اسکا خالق شاہد ہے ... کہ یاسی کو سی۔ روکھی سوکھی جو میسر آئی شکر کیا اور کھالی۔ سامنے ہے وہ اصلی گھر جہاں میں نامراد چلی اور قریب ہے وہ وقت جب دونو چچا اور چچی ایک سچے حاکم کے سامنے اسباب کے جواب دہ ہوں گے کہ انہوں نے مہمان بھتیجی کو لونڈیوں سے بدتر رکھا

169323

دیکھتی ہوں سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ ماں باپوں کی بیٹیاں فاقے ... تے کرتے مرجاتی ہیں۔ مگر حرف شکایت زبان پر نہیں آتا میرے ... بھی ہیں ایسی بدنصیب بچیاں اور مظلوم بیٹیاں کہ کائنات کی ... اور زندگی کا ہر سانس ان کے واسطے مصیبت تھا لیکن دنیا ... انکا جانی دشمن تھا آج ان کے صبر و استقلال کی داد ... ملکت ماہتاب اور منتشر تارے چمک چمک کر اور دمک ... بھری دنیا کی ان بسنے والی روحوں پر ناز کر رہے ہیں ... دی مگر جوہر شرافت ہاتھ سے نہ دیا۔

... اری میرے صبر اور میرے استقلال کا یہ بدلا نہ تھا کہ میں